عشق لا
از فریال سید

السلام علیکم

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول،افسانہ،شاعری، ناولٹ،کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک،انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

WWW.NOVELSCLUBB.COM

عشقِ لا

از

فریال سید

www.novelsclubb.com

انتساب!

ہر ذی روح کی پہلی محبت کے نام

بادلوں سے اوپر، آسمان اتنا نزدیک ہو کے بھی خاصا دور تھا۔ نیلا آسمان پوری کائنات میں خدا کی بنائی گئی ان گنت حسین نعمتوں سے بڑھ کے پسند تھا۔ پتا نہیں کیا تھا پر اسے اپنا اور آسمان کا تعلق گہرا لگتا تھا خواہ وہ راتوں کو کالی آسمان کی چادر پہ ٹنکے ڈھیروں ننھے منے تاروں کو تکنا ہو یا صبح سویرے طلوع ہوتے سورج کو دیکھنا۔ دن کو نکھرے ہوئے نیلے آسمان پہ سفید روئی کے گالوں کا سنہرے سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا ہو یا شام کو ڈھیروں رنگ آسمان پہ بکھیرتا غروبِ آفتاب کا منظر۔

بس اسے پتا تھا، تو صرف یہ کے اسے آسمان سے عشق تھا۔

"خواتین و حضرات اپنے حفاظتی بند باندھ لیجیے ہم کچھ ہی دیر میں کراچی ایئرپورٹ لینڈ کرنے والے ہیں شکریہ۔"

وہ ایک دم چونکی۔ خیالوں کا غلبہ اور آسمان کو اتنے قریب سے دیکھنے کا احساس ہی اتنا ہوش اُڑا دینے والا تھا کہ وہ کھو سی گئی تھی۔

نسوانی آواز اب ہدایات انگریزی میں دہرا رہی تھی۔

اپنے بابا اماں اور لالا سے کچھ ہی دیر میں ملنے کے خیال نے اسے سکون سا دیا تھا۔

ہیزل برائون آنکھیں طمانیت سے موند کے عائلہ سید نے اپنا سر سیٹ کی بشت سے لگا لیا۔

کچھ دیر متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اسے لالا کا چہرہ نظر آ ہی گیا۔

آج پھر اسے ائیرپورٹ سے لینے صرف لالا ہی آئے تھے۔

اس نے ٹھنڈی آہ بھر کے اپنی چادر ٹھیک کی اور دور کھڑے لالا کی طرف بڑھ گئی۔

وہ کالا چشمہ ہاتھ میں پکڑے جھنجھلائے ہوئے انداز میں اسے ہی ڈھونڈھ رہے تھے۔لالا نے اسے اپنی طرف آتا دیکھ کے خیر مقدمی مُسکراہٹ کے ساتھ جوش سے اس کی طرف ہاتھ ہلایا۔

بڑے بھائی کی محبت پہ وہ مُسکرائی۔ان کے قریب جا کے ہلکا سا سر کو خم دیا تھا تاکہ لالا سر پہ ہاتھ رکھ سکیں۔

"السلام وعلیکم لالا۔"

اس کے سر پہ نہایت نرمی سے ہاتھ رکھتے لالا نے جوش سے جواب دیا:

"وعلیکم السلام گودی!"

www.novelsclubb.com

"گودی" فارسی، بلوچی اور براہوی میں شہزادی کو کہا جاتا ہے۔ بلوچستان میں یہ لفظ خواتین کو عزت دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عائلہ کو اس کے دادا گودی کہتے تھے۔ اب رفتہ رفتہ وہ سب کی گودی بن چکی تھی۔

لالا مزید بولے: "کیسی ہو؟ سفر کیسا رہا؟ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟ کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں؟"

لالا کے اتنے سارے سوالوں کے جواب میں وہ صرف مُسکرا ہی سکی۔

"چلیں؟"

تھکاوٹ سے چور لہجے میں عائلہ نے پوچھا، تو معید سید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

گاڑی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے آخر عائلہ پوچھ بیٹھی: "بابا آج پھر نہیں آئے؟"

www.novelsclubb.com

معید کے قدم تھوڑے ٹھٹکے پر وہ بولا تو لہجہ بالکل عام سا تھا: ''پگلی! پتا تو ہے تمہیں بابا کتنے مصروف ہوتے ہیں اور دیکھو تمہارا ہینڈسم لالا خود آیا ہے۔ کیا یہ کافی نہیں؟''

عائلہ کو ان کی مُسکراہٹ مصنوعی لگی۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ نہ ہوتا، تو وہ کبھی اس سے جھوٹ نہ کہہ پاتے۔ وہ بھائی کی آنکھیں پڑھنے میں ماہر تھی پر اب احساس ہوا کہ وہ ہونٹ بھی پڑھ سکتی ہے۔

لالا کا دل رکھنے کو عائلہ بھی مُسکرا دی:

''آپ اکیلے کہاں آئے ہو پورا کانوائے ساتھ لائے ہو۔''

مصنوعی غصہ چہرے پہ سجاتے، عائلہ نے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھائی تھی۔

معید سید کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

وہ بچپن سے اپنی بہن کی عادت سے واقف تھا۔اسے اپنی گاڑی کے پیچھے بندوقیں اٹھائے گارڈز کی گاڑیاں زہر لگتی تھیں۔وہ کبھی انہیں کانوائے بلاتی تو کبھی بابا کی فوج۔وہ سوچے جارہا تھااور اپنے سامنے کھڑی 20 سالہ اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اس کے لیے آج بھی وہی عائلہ تھی، چھوٹی سی معصوم عائلہ جس کی ناک کھینچ کے اکثر وہ اپنی محبت کا اظہار کرتا تھا۔کوئی کچھ بھی بولے وہ جانتا تھا اس کی عائلہ اس کی گودی کبھی اس کی یا اس کے بابا میر ابراہیم سید کی عزت پہ آنچ نہیں آنے دے سکتی

۔

"لالا۔"

عائلہ نے ان کے چہرے کے سامنے انگلیاں لہرائیں۔

"کہاں کھو گئے؟"

www.novelsclubb.com

اپنے ہونٹوں پہ سجی دو سال پرانی کرب کی داستان کو نہایت سلیقے سے چھپاتے ہوئے وہ مُسکرایا:

"میں سوچ رہا تھا اب جب کہ آ ہی چکی ہو، تو اپنی بھابی کو بھی ساتھ لے آتی۔"

عائلہ نے پہلے حیرت سے بھائی کو دیکھا پھر کھلکھلا کے ہنس دی اور معید سید نے دل ہی دل میں اس کی ہنسی کی سلامتی کی دعا کی تھی۔

☆...☆...☆

میر ابراہیم سید کا تعلق بلوچستان کے ایک نشیبی گائوں سے تھا۔ یہ ان کا آبائی گائوں تھا۔ ان کے آباء واجداد نے چشت سے ہجرت کر کے بلوچستان کے اس چھوٹے سے گائوں میں اپنا پڑائو ڈالا تھا۔ خواجہ ولی بابا مودودی چشتی کا مزار آج بھی ان کے گائوں کے بیچ و بیچ اپنی پوری شان و شوکت سے موجود تھا۔ خواجہ بابا، خواجہ قطب الدین مودودی چشتی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے خواجہ

مودودی چشتی کے اسلام کے فروغ کے لیے کی گئی کوششوں کی،ان کے علم، فہم وفراست کے چرچے آج بھی تاریخ کے اوراق پہ رقم ہیں۔وہ دو مشہور کتابوں کے مصنف بھی تھے۔''منہاج العارفین''اور''خلاست الشریعہ''خواجہ ولیوں کے حلقے میں بلند مقام رکھتے تھے۔وہ عاشقِ رسول ﷺ اور اسلام کے سچے طالبِ علم تھے۔کہا جاتا ہے کہ خواجہ مودودی چشتی جب حضرت خواجہ ناصر ابو یوسف بن سمان چشتی کے مرید بنے تو ان کے مرشد نے ان سے کہا تھا:

''اے قطب الدین مودودی فقر کو اپنالو۔''

کہا جاتا ہے کہ اپنے مرشد کا اشارہ سمجھتے ہوئے انہوں نے فقر کو ایسے اپنایا کہ خدا کی محبت سے مالا مال ہو گئے۔تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے 20 سال دنیاوی زندگی سے دور ایک بیابان میں ذکرِ الٰہی کرتے گزار دیے۔مشہور مورّخوں کی کئی تحریروں میں شواہد موجود ہیں کہ خواجہ نے ان 20 سالوں میں دو قرآن پاک دن میں اور دو قرآن پاک رات میں مکمل کیے ہیں۔تاریخ یہ بھی لکھتی ہے کہ خواجہ کی زبان پہ

کلمہ طیبہ کے ورد کے علاوہ صرف قرآن پاک کی تلاوت ہی رہی۔ کھانا پینا براہِ نام تھا۔انہوں نے 7 سال کی عمر میں ہی قرآن پاک اپنے والد صاحب کی راہنمائی سے حفظ کر لیا تھا۔ یہ ان کی اسلام سے محبت ہی تھی جو اللہ پاک نے انہیں وہ عروج بخشا کہ مولانا زکریا نے انہیں ''کشِ قلوب ''اور ''کشفِ قبور ''کہا۔ کہتے ہیں کہ خواجہ مودودی چشت سے ''بلخ'' بھی گئے تھے جو مولانا رومی کی جائے پیدائش ہے۔ وہاں بھی انہوں نے کئی صوفی علم کے طالبوں کو اپنے علم سے مستفید کیا۔ پھر بخارا بھی گئے جسے اس وقت اولیائے کرام کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل تھی۔

کہتے ہیں کہ جب خواجہ مودودی صاحب وفات پا گئے تو ان کا جسدِ خاکی اڑ کے اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچا تھا اور یہ واقعہ سناتے ہوئے خواجہ فرید الدین شکر گنج بخش چکرا کے گر پڑے تھے۔ خواجہ کا مزار آج بھی چشت، ہیرات افغانستان میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

www.novelsclubb.com

خواجہ ولی بابا ان ہی کی اولاد میں سے تھے۔ جنہیں خواب میں اشارہ ملنے کی وجہ سے ہیرات سے ہجرت کر کے بلوچستان آنا پڑا۔ان کے ساتھ ساتھ ان کی فارسی زبان اور ثقافت بھی ہجرت کر کے آگئی تھی۔

خواجہ ولی مودودی چشتی کے آنے سے پہلے کلی کرانی کا نام کلی گرانی تھا۔ ''گرانی'' بلوچستان کی کئی زبانوں میں بھاری پن کے لیے استعمال ہوتا تھا۔بھاری پن سے مراد وہ کلی آسیب زدہ تھی۔ جہاں خواجہ ولی بابا نے قیام کیا اور بعد میں ان کی اولاد نے ان کی دن رات عبادات نے اس جگہ کو پاک کر لیا۔آج تقریباً خواجہ ولی بابا مودودی چشتی کو وفات پائے چھے صدیاں گزر چکی ہیں پر آج بھی بلوچستان کے نقشے پہ کلی سادات کرانی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے اور ان کی فارسی اور ثقافت کو ان کی اولاد زندہ رکھے ہوئے ہے۔

www.novelsclubb.com

سب سے پہلے ان کا مزار مٹی سے بنایا گیا تھا، جس کے اطراف میں 1970ء میں ساداتِ کرانی نے اینٹوں کی دیوار بنا کے احاطہ کر دیا تھا پھر 1973ء میں اس وقت

کے وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو نے خود نوٹس لیتے ہوئے ایک عالی شان مزار تعمیر کروانے کا حکم دیا جس میں پھر وقتاً فوقتاً سادات خود مزید تبدیلیاں کرواتے رہے۔

2008ء میں بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر وزیراعلیٰ بلوچستان اسلم رئیسانی نے خواجہ بابا کے مزار کے اطراف میں پھیلے سادات کے 600 سال قدیم قبرستان کی حفاظت کے لیے مضبوط احاطہ بنوانے کا اعلان کیا۔

رئیسانی قبیلہ بھی دیگر کئی قبیلوں کی طرح خواجہ ولی بابا کے مرید ہونے پہ فخر محسوس کرتا تھا۔

خواجہ بابا کے مزار میں بہت سی تبدیلیاں ہوتی رہیں، مگر آج اگر مغربی بائی پاس سے گزرتے ہوئے ایک بہت ہی خوبصورت مزار دن میں سنہری گنبد کے ساتھ اور رات میں بے پناہ ننھے منے برقی قمقموں کے بیچ چمکتا دکھائی دے، تو یہ ہی خواجہ ولی بابا مودودی چشتی کا مزار ہے اور یہ ہی کلی سادات کرانی ہے۔

کلی کرانی کوئٹہ شہر کے حدود سے کچھ ہی فاصلے پہ تھا جو بعد میں شہر کے رقبے میں اضافے کے ساتھ ساتھ کوئٹہ شہر سے قریب ہوتا گیا۔اب یہ فاصلہ کم ہو کے 6 کلو میٹر ہی رہ گیا تھا۔

اُن کے گائوں کی مشہوری کی دوسری اہم وجہ وہاں کے باغات ہیں۔

انگور، سیب، چیری، انار، آلو بخارے، زنتوزہ (پلم)، خوبانی، بادام، شہتوت، پستے اور اخروٹ کے خوبصورت باغات جن کا پھل کھا کھا کے ان کی نسلیں بڑی ہوئی تھیں۔شہر سے دور یہ چھوٹا سا گائوں نہایت پر سکون تھا۔

معززین میں سادات کو کافی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، لیکن جہاں اتنی عزت مقام اور شہرت ہو وہاں دوستوں کے ساتھ ساتھ دشمن بھی بن جاتے ہیں بلاوجہ یونہی۔

یہی دھڑکا میر صاحب کو بھی لگا رہتا تھا۔تب ہی وہ دونوں بچوں کی حفاظت کے لیے بہت فکر مند رہتے تھے۔وہ اسکول جاتے، سد حفاظتی انتظامات کے باوجود میر

صاحب اور ان کی سادہ سی بیگم سکینہ سید صاحبہ نہایت فکر مند رہتی اور آخر ایک دن وہ ہو گیا جس کا انہیں ڈر تھا۔ان کے بچوں کی گاڑی پہ اسکول سے واپسی پر فائرنگ کی گئی۔ارادہ اغوا کا تھا بچے محفوظ رہے، لیکن گارڈز زخمی ہوئے۔14 سالہ عائلہ اور 16 سالہ معید گھر آئے تو میر صاحب اور ان کی بیگم کی جان میں جان آئی تھی۔

اپنے بچوں کے ستے ہوئے چہرے دیکھتے ہی میر صاحب نے دل ہی دل میں گائوں چھوڑنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا اور آخر اس پہ عمل درآمد کر کے ہی دم لیا۔یوں اولاد کی محبت جیت گئی اور 7 سال پہلے میر ابراہیم سید، اپنی بیوی اور دونوں بچوں سمیت کراچی شفٹ ہو گئے۔

www.novelsclubb.com

"اماں۔"

عائلہ نے سرگوشی میں کہا اور ان سے لپٹ گئی۔

"میری بیٹی، میری گودی۔" کہہ کے اس کی ماں نے ماتھا چوما۔ پھر دو پل عائلہ کو دیکھا، دوبارہ سے خود سے لگالیا۔ ان کی اتنی محبت پہ عائلہ کے آنکھوں کے کونے بھیگ گئے۔ اس نے اپنے گال پہ رکھے ماں کے ہاتھ کو نرمی سے ہاتھوں میں لے کے اس کی پشت کو چوما۔ یہ بلوچستان کا رواج تھا، اپنے بڑوں کو عزت دینے کا طریقہ تھا۔

"اللہ حیاتی دے، نیک نصیب کرے۔"

کہہ کے سکینہ سید نے عائلہ کے سر پہ پیار کیا۔

"ارے! بھئی کوئی مجھے کھانا وانا بھی پوچھے گا یا ماں بیٹی یہیں ساری باتیں کریں گی۔"

www.novelsclubb.com

معصوم سی شکل بناتا معید سید، ابھی تک انہیں لان میں کھڑا پا کے بولا تھا۔

"چلو چلو! کھانا تیار ہے بس تم دونوں منہ ہاتھ دھو لو۔"

پیار سے سکینہ صاحبہ نے اپنے اکلوتے سپوت کو دیکھا۔ سنہرا رنگ گرمی کی حدت سے قدرے گلابی ہو رہا تھا۔ 6 فٹ سے نکلتا قد، ڈارک برائون گھنے بکھرے ہوئے بال، شہد جیسی آنکھیں اور سفید کاٹن کا سوٹ جس کی سلوٹیں معید سید کی تھکاوٹ کی گواہی دے رہی تھیں۔ انہوں نے نظر لگ جانے کے ڈر سے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کے اس پہ پھونکا تھا۔

جواب میں معید نے ان کے گرد اپنے بازو پھیلا کے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ان کے پیچھے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی عائلہ نے پر سوچ نگاہیں بابا کے کمرے کی کھڑکی پہ جمائی تھیں۔

"بابا! میرے اچھے بابا۔ کب تک یونہی ناراض رہیں گے اپنی عائلہ سے۔" دل ہی دل میں خود سے کہتی عائلہ کی آنکھوں سے کچھ آنسو ٹپک کے اس کی کالی بلوچی کڑھائی والی چادر میں جذب ہو گئے۔

"عائلہ! کدھر ہو بھئی آ بھی جائو، بہت اہتمام کیا ہے اماں نے۔"

معید کی آواز پہ وہ چونکی۔اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"آئی لالا۔"اور تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اندر چلی گئی۔

آف وائٹ تھیم کے ساتھ، میچنگ آف وائٹ دبیز پردے،لان کی طرف کھلنے والی وسیع کھڑکی پہ نزاکت سے لہرا رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پہ صوفے پہ براجمان میر ابراہیم سید پر سوچ نگاہوں سے پردوں کو دیکھ رہے تھے جن کے کناروں سے آتی دوپہر کی نارنجی دھوپ چھن کے کمرے میں جلترنگ مچائے ہوئے تھی۔

معید کی گاڑی کا ہارن سنتے ہی وہ تیزی سے اٹھے اور پردے ہٹا دیے۔ایک دم سے دھوپ پڑنے پہ ان کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے میچ سی گئی تھیں۔روشنی سے مانوس ہوتے ہی انہوں نے اپنی آنکھیں لان میں کھلتے ووڈن گیٹ پہ ٹکا دیں۔

معید کے ساتھ ان کی پری،ان کی شہزادی بیٹی عائلہ تھی جسے آج خود وہ پورے دو سال بعد دیکھ رہے تھے۔

"عائلہ میری گڑیا!"

عائلہ ایسی تو نا تھی، انہوں نے کھڑکی کے پار کھڑی اپنی بیٹی کو دیکھا۔

کالی چادر اوڑھے، کالے ہی سادہ سے ملگجے جوڑے میں ملبوس، پیروں میں سادہ سی کالی چپل پہنے، پھیکے پڑتے رنگت والی، بکھری بکھری سی وہ لڑکی، کہیں سے عائلہ نہیں لگ رہی تھی۔

عائلہ تو اتنی خوش پوش تھی کہ لوگ اس کے کپڑوں کو ہی دیکھ کے اس کے بہترین ذوق کا اندازہ لگا لیتے تھے۔اس کو ڈیزائننگ کا شوق تھا اپنے کپڑے زیادہ تر وہ خود ہی ڈیزائن کرتی تھی۔

"بابا! میں عام لڑکیوں کی طرح ہی سوچتی ہوں، میں پڑھنا چاہتی ہوں بابا، مجھے شانزے، شازمینہ یا علیزے نہیں بننا۔پلیز بابا سمجھیں نا۔"

عائلہ کی آواز اُن کے کانوں میں گونجی تھی۔کچھ دھندلے سے منظر بھی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

"پر بچہ! تم نے نوکری تھوڑی کرنی ہے؟ان کی طرح میٹرک کرو گھر بیٹھو۔"

عائلہ کو پیار سے سمجھانے کی ان کی یہ کوشش تب ناکام ہوئی،جب عائلہ بولی:

"پر بابا آپ نے وعدہ کیا تھا جب آپ ہمیں کراچی لائے تھے کہ آپ مجھے پڑھائیں گے اور لالا بھی تو پڑھ رہے ہیں۔میں بھی انہی کے کالج میں داخلہ لے لوں گی بس!"

اب عائلہ کی آنکھیں آنسوئوں سے لبریز تھیں اور یہ اس کا واحد ہتھیار تھا جس کے سامنے میر صاحب اپنے پتھر دل اور ظالم روایات کو ٹھوکر مار دیتے اور بیٹی کی محبت جیت جاتی تھی ہر دفع۔

پر سوچ نظروں سے بیٹی کا شفاف چہرہ تکتے ہوئے،انہوں نے کہا:

"ٹھیک ہے! پڑھ لو اجازت ہے تمہیں، پر عائلہ یاد رکھنا تمہارے بابا نے تم پہ اتنا اعتبار کر کے یہ اجازت دی ہے کہ اپنی روایات اور دل میں اُٹھتے خدشات کو نظر انداز کر ڈالا، اب یہ تمہارا فرض ہے کے میری عزت کا خیال رکھو۔"

حیران آنکھوں کے ساتھ عائلہ نے انہیں دیکھا اور اگلے لمحے ان کا ہاتھ پکڑ کے چوما تھا۔

"بابا میں آپ کی عائلہ ہوں، میری رگوں میں آپ کا خون ہے، میرا بھروسا کریں بس! پھر دیکھیں۔"

اس کی آنکھوں سے دو آنسو بہے تو میر صاحب نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔

www.novelsclubb.com

"نا بچہ روتے نہیں"

وہ بے ساختہ مُسکرائی تھی۔ حسین تو وہ تھی ہی روتی آنکھوں کے ساتھ مُسکراتی اتنی پیاری لگی کے میر صاحب نے نظر لگ جانے کے ڈر سے نظریں چرائی تھیں۔

"عائلہ ! کہاں ہو بھئی۔"

معید کی آواز پہ ماضی کا وہ منظر میرا ابراہیم سید کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سامنے لان میں کھڑی عائلہ انہی کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی پہ یک طرفہ کانچ ہونے کی وجہ سے عائلہ اُنہیں نہیں دیکھ سکتی تھی، مگر وہ عائلہ کو دیکھ سکتے تھے ۔عائلہ کی آنکھوں سے آج بھی دو آنسو گرے تھے۔پر آج ان کا دل موم نہ ہوا تھا ۔عائلہ کاش دو سال پہلے تم نے وہ سب نہ کیا ہوتا، کاش تم میری عزت کا خیال کر لیتی، کاش سوچتی تم عام لڑکی نہیں ہو تم سید زادی ہو، تو آج یہ کرب تمہاری اور میری تقدیر نا ہوتا۔ کاش ! عائلہ کاش !

پر تم نے کچھ نا سوچا اور میرا بھروسا توڑ ڈالا۔اب تم اسی لائق ہو کہ بھگتو، تم ایسے ہی اپنے بابا کے لیے تڑپو۔ میں نے تمہیں اپنا اعتبار، بھروسا، پیار، سب دیا بدلے میں تم نے کیا دیا؟

دھوکا؟ دھوکا؟"

نہیں میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ میں بے قصور ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔ بابا میرا اعتبار کریں پلیز میری بات تو سن لیں۔"

جواب میں بابا نے ایک زناٹے دار تھپڑ عائلہ کے آنسوئوں سے تر چہرے پہ رسید کیا تھا۔

عائلہ سن رہ گئی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے بابا کو دیکھتے، وہ اب بھی بولنا چاہتی تھی ،اپنی صفائی دینا چاہتی تھی، پر اس کے ہونٹ نہیں ہل رہے تھے، اس نے کوشش کی اماں کو دیکھ سکے، لالا کو دیکھے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے اعتبار ڈھونڈے پر اس کی آنکھیں بھی نہیں ہل پا رہی تھیں۔ بابا کے چہرے کی سختی اور نفرت پہ گڑھ سی گئی تھیں۔ اسے اپنے دماغ میں دھماکے سے محسوس ہوئے، کانوں میں آتش فشاں پھٹنے کی آوازیں۔ وہ اپنے کانوں کو دونوں ہاتھوں سے بند کر لینا چاہتی تھی، وہ سب کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کا سر پھٹ رہا ہے پر اس کے لب خاموش تھے، آنکھیں خشک تھیں، جسم بے جان تھا۔ کپڑے کی گٹھڑی کی طرح اس کا وجود اس بڑے

سے لائونج کے سفید چمکتے سنگ مرمر کے فرش پہ پڑا تھا۔اسے پہلی دفع نفرت کا مطلب پتا چلا تھا، دھتکارے جانے کی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔بے اعتباری کا وار اتنا کاری تھا کہ وہ سہ ناپا رہی تھی پر بے بس تھی سہے جا رہی تھی۔

اچانک اسے لگا بابا پہ گرتی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا، سر کا درد شدت سے بڑھا تھا،اس کا دل کیا وہ چیخے زور سے چیخے اپنی ساری تکلیف سارا کرب نکال باہر پھینکے۔اس نے کوشش بھی کی پر اس کے سامنے پورا لائونج گھوم سا گیا، کانوں میں گونجتی آوازوں کی جگہ سائیں سائیں کرتی خاموشی چھا گئی۔اسے اپنی ناک سے گرم سیال سا گرتا محسوس ہوا، سکوت تھا کے ہر شے پہ پھیلنے لگا جو آخری آواز اسے سنائی دی وہ ذاکرہ کی تھی جو براہوی میں کہہ رہی تھی:

www.novelsclubb.com

"او بلا باجی! کسک گودی۔"

"بڑی باجی! گودی مر گئی۔"

عائلہ سید نے خرد کے جہاں سے بے خبر ہونے سے پہلے ذاکرہ کی بات سچ ہونے کی دعا کی تھی۔

''معید! تمہارے بابا؟''

یہ اماں کی آواز تھی جسے وہ لاکھوں آوازوں میں آرام سے پہچان جائے۔ وہ لالا سے بابا کا کیوں پوچھ رہی تھیں؟ بند آنکھوں مگر بے دار دماغ نے اسے سوچنے پہ مجبور کیا تھا۔

''اماں بابا نہیں آئے۔''

یہ تھکی تھکی سی آواز اس کے پیارے لالا کی تھی۔

www.novelsclubb.com

''وہ کہہ رہے تھے، میں گھر پہ رہ کے دعا کروں گا۔''

''اچھا؟''

کیا کیا نا تھا اماں کے اس چھوٹے سے ''اچھا'' میں، خوش امیدی، خوش گوار حیرت، خوشی اور بے یقینی۔ معید بھی عائلہ کی طرح اپنی سادہ سی ماں کے لہجے سے ان کی سوچ تک پہنچ گیا، تو مزید بولا:

''جی! میں بھی آپ کی طرح حیران ہوا تھا، پر پھر بابا نے کہا کہ حیران کیوں ہوتے ہو معید میں دعا کروں گا کہ عائلہ واپس...ن نہ آئے اور خدا پھر کسی کو عائلہ جیسی بیٹی نہ دے۔''

لالا کا ٹوٹا ہوا لہجہ اور بکھرے الفاظ ان کی پریشانی کی گواہی دے رہے تھے۔

پر بابا؟ وہ تو مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، وہ ایسا کیوں کہیں گے، وہ بھی میرے لیے؟ عائلہ سوچ رہی تھی۔ ذہن پہ زور ڈال رہی تھی۔ اسے کچھ بھی یاد کیوں نہیں؟

WWW.NOVELSCLUBB.COM

وہ کشش و پنج میں مبتلا تھی کہ اس کے ہاتھ کی پشت پہ اسے کچھ نم سا گرتا محسوس ہوا۔ وہ آنکھیں کھولنا چاہتی تھی، اپنا ہاتھ ہلانا چاہتی تھی، اسے کسی کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں، وہ اماں تھیں شاید، پر وہ کیوں رو رہی تھیں؟

عائلہ حیران تھی، وہ اُنہیں بتانا چاہتی تھی وہ ٹھیک ہے، رونے کی ضرورت نہیں، مگر وہ لاکھ کوشش کے باوجود ایک انگلی تک نہیں ہلا پا رہی تھی۔

اماں رو رہی تھیں ساتھ میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ شاید کسی کو کوس رہی تھیں، پر کسے؟

اس نے سننا چاہا، پر وہ کوئی نام نہیں لے رہی تھیں۔ آخر کون تھا جسے اس کی اماں، فرشتوں جیسی اماں، بددعا دے رہی تھیں؟

وہ تو دشمن کو بھی دعا دیتی تھیں، کون تھا جو ان کے لیے دشمن سے بڑھ کے تھا؟

www.novelsclubb.com

WWW.NOVELSCLUBB.COM

اپنی اُلجھن پر پہ قابو پاتے ہوئے اس نے پھر سے اماں کے بے ربط کو سنوں پہ توجہ دی، تو اس پہ درد کا پہاڑ ٹوٹ گیا، اماں نے ''وہ'' نام لے کے کوسا تھا۔

وہ نام جو اس کی ذات بن چکا تھا، وہ نام جسے اس کا دل کرتا کوئی اور نہ لے، اس کا نام تک وہ کسی اور کے منہ سے نہیں سننا چاہتی تھی اور اس کی ماں اسے بد دعا دے رہی تھیں۔

ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا، اماں کو اس کا نام کیسے پتا چلا؟

وہ مر جاتی پر کبھی کسی کو اس کا نام نا بتاتی، اماں کو کس نے بتایا؟

اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں سی بج رہی تھیں، کچھ تھا جو اسے ناگہانی کی اطلاع دے رہا تھا۔

www.novelsclubb.com

اچانک لالا کی آواز پہ اس کے وسوسوں کا سلسلہ ٹوٹا یا شاید اس کے خدشوں نے حقیقت کا روپ دھارا تھا۔ وہ بول رہے تھے اور عائلہ کو اپنی سانس رکتی محسوس ہو رہی تھی۔

"اماں وہ بھی بھگت رہا ہے۔"

عائلہ کو اپنا دماغ سن ہوتا محسوس ہوا۔

"ہڈیاں توڑی ہیں۔"

اس کی بند آنکھیں جلنے لگیں۔

"خون میں لت پت۔" اس کا دل ڈوب سا گیا۔

www.novelsclubb.com

"بچ بھی جائے مشکل۔" عائلہ کو کمرے میں دھماکے ہوتے محسوس ہوئے۔

"ادھر ہی پھینک آئے ہیں۔"

عائلہ کو شدید درد محسوس ہوا، اپنے دل میں شاید۔

"صبح تک کسی کو دِکھے گا بھی نہیں۔"

عائلہ کو درد شدید ہوتا محسوس ہوا، دھماکے اور زوردار، اب ان دھماکوں میں بہت سے مشینوں کی ٹوں ٹوں بھی شامل ہو گئی تھی۔

لالا شاید چیخ رہے تھے، ڈاکٹر کو بلا رہے تھے۔

اسے اپنا دم نکلتا محسوس ہوا اور اس کے ہونٹوں پہ اس کے دل میں سالوں سے چھپا راز آخر آ پہنچا۔

اس نے سرگوشی سے کہا تھا:

"عبداللہ!"

www.novelsclubb.com

☆...☆...☆

سمندر کنارے موجود یہ چھوٹا سا کیفے، یوں تو روز ہی لوگوں کے ہجوم سے بھرا رہتا، پر اتوار کے دن یہاں کی رونق ہی اور ہوتی۔ ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والے

جوان، جو ٹولیوں میں ون وہیلنگ کرنے کے بعد یہاں ایک ساتھ کافی کا مزہ لینے آتے یا انہی پوش علاقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین، اپنی سہیلیوں کے ساتھ، کسی مشہور برانڈ کی برائیاں اور کافی کے چسکیوں کا مزہ ایک ساتھ لیتی نظر آتیں۔ایسے ہی کبھی کوئی بھٹکی ہوئی اولاد بھی اپنے ضعیف العمر والد یا والدہ کی وہیل چیئر گھسیٹتی نظر آتی جس پہ براجمان سپاٹ چہرے والی شخصیت کو کونے میں نوکر کے حوالے کر کے خود فری وائی فائی کو استعمال کرنا اپنا فرض سمجھ کے موبائل میں گم ہو جاتے۔اکثر کوئی آرٹسٹ بھی دکھ جاتا جو کسی کونے میں سر جھکائے اپنی کافی پیتے یا پھر کیفے کی گلاس وال کے پار سورج اور سمندر کے ملاپ کے منظر میں گم نظر آتا۔ غرض یہ کے یہاں کا ماحول نرالا تھا، کوئی کچھ بھی کرے کسی کو کسی سے سروکار نا تھا ،یہی وجہ تھی کے عائلہ سید کو بھی یہاں کا ماحول پسند آگیا تھا۔اسے یہاں آتے ہفتہ ہونے والا تھا۔پر وہ اس اتوار کے سحر سے نہ نکل پائی تھی، یا یوں کہہ لیں اس کے لفاظی کے سحر سے، تبھی روزانہ اس کیفے آتی، اس کا انتظار کرتی اور چلی جاتی۔آج

www.novelsclubb.com

پورا ہفتہ ہونے کو تھا۔پر وہ نہ آیا۔عائلہ کو تو اس کا نام تک نہ پتا تھا کہ اچانک اپنی ٹیبل پہ کافی رکھتے بیرے کی شکل نے اسے چونکا دیا،یہی تو تھا اس دن جو اس شاندار شخص سے خوش گپیاں لگا رہا تھا۔عائلہ کی نظر بیرے کی شرٹ پہ سجے اس کے نام کے بیج پہ گئی۔

"عمران خان سنو۔"

وہ جو کافی رکھ کے جانے کو مڑا ہی تھا کہ عائلہ کی آواز پہ چونکا۔

"عبداللہ" عائلہ نے نرمی سے اس کا نام دہرایا تھا۔

"جی باجی! عبداللہ،عبداللہ سکندر۔پچھلے دو سال سے ہر اتوار کے دن یہاں آتے ہیں اور اسی طرح کسی بہترین کتاب کا خلاصہ دیتے ہیں۔اکثر لوگ تو یہاں صرف ان کی آواز اور باتیں سننے آتے ہیں۔"

بیر انہایت پر جوش اور عقیدت مندانہ انداز میں عائلہ سید کو عبداللہ کے بارے میں معلومات دے رہا تھا، جنہیں وہ بڑے انہماک سے سن رہی تھی۔

''اچھا سنو! کرتے کیا ہیں تمہارے عبداللہ صاحب؟''

عائلہ کے مزید کریدنے پہ بیر اپھر سے سادہ سے لہجے میں بولا:

''بہت پڑھے لکھے ہیں جی عبداللہ بھائی، ایم ایس سی کیا ہے۔ بہت خوددار ہیں، اپنے بل بوتے پہ بنایا ہے خود کو، اب بھی ایک نجی کالج میں لیکچرار ہیں اور ساتھ میں ایم فل کر رہے ہیں۔ بہت ذہین بندے ہیں جو بھی ایک دفعہ ان کی باتیں سن لے، ان سے مل لے، اگلی دفعہ ضرور آتا ہے۔''

عائلہ نے پہلے ہی سے خم کھائی ہوئی ابرو کو تھوڑا اور تان کے عمران کے چہرے پہ جھوٹ یا خوشامد کا شائبہ ڈھونڈا، پر ادھر صرف جوش تھا، اس شخص کے لیے محبت تھی عقیدت تھی۔

وہ مُسکرائی اور خود کو حیرت سے تکتے اس سترہ سالہ، سرخ و سفید رنگت والے ، معصوم، کھرے، جذبات سجے چہرے کو دیکھا اور بولی:

"شکریہ! عمران خان، آپ بھی دل لگا کے پڑھو، میں دعا کروں گی ایک دن آپ بھی اپنے عبداللہ بھائی کی طرح بڑے آدمی بنو۔"

اب کے عمران خان جوش سے بولا:

آپ دیکھنا باجی، میں بھی ایک دن ادھر کھڑے ہو کے عبداللہ بھائی کی طرح لوگوں کو ادب کی طرف مائل کروں گا۔"

اس نے اس مخصوص کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں عبداللہ سکندر ہر اتوار کے دن کسی بہترین کتاب پر اپنا تجزیہ پیش کرتا تھا۔اس کا مقصد نئی نسل کو ادب کی طرف راغب کرنا تھا اور وہ کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی تھا۔

عائلہ کو اتنا اندازہ تو عمران خان کی باتوں سے ہو ہی گیا تھا اور وہ اس کا عملی مظاہرہ خود بھی دیکھ چکی تھی اس دن۔

اس دن، ہاں اس دن۔

عائلہ کو کراچی میں رہتے کئی سال ہو گئے تھے۔بی اے کے بعد آج کل وہ فارغ تھی۔فراغت کا وقت بھی وہ اپنے پسندیدہ مشغلے ڈیزائننگ میں ہی لگاتی تھی۔سارا سارا دن ذاکرہ کو ساتھ لیے، تو کبھی اماں کے ساتھ، کسی نا کسی شاپنگ مال میں سر کھپاتی رہتی۔وہ بچپن ہی سے بہت خوش لباس تھی، یہ موروثی تھا، اس کے بابا اماں دونوں بہت خوش پوش تھے، کچھ کچھ اُنہیں دیکھ دیکھ کے اور کچھ کچھ پیسے کی فراوانی نے عائلہ کے شوق کو اتنی ہوا دے دی تھی کے اب وہ فیشن ڈیزائننگ کی ڈگری کو کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا چکی تھی۔اس کی اسی ضد نے اس کے بابا کو بھی مجبور کر دیا تھا اپنی روایات توڑنے اور اسے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دینے پہ۔

ایک ایسا ہی عام سا دن تھا۔جب شاپنگ مال میں سر کھپانے کے بعد اس نے کافی کے غرض سے فوڈ کورٹ کا رخ کیا۔پر ادھر چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے تِل دھرنے تک کی جگہ نہ پا کے،وہ اُلٹے قدموں پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔

ذاکرہ کبھی اپنا دوپٹا تو کبھی ہاتھوں میں لدے شاپر سنبھالتی نڈھال سی اس کے پیچھے پیچھے پارکنگ کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ذاکرہ لگ بھگ اس کی ہم عمر تھی۔ جب میر ابراہیم سید کراچی شفٹ ہو رہے تھے،اس کی ماں نے اپنے جدی پشتی کنیز ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے،اپنے جگر کے ٹوٹوں کو ان کی خدمت میں دے دیا تھا۔ گل محمد،معید سید کا خدمت گزار قرار پایا،جب کہ ذاکرہ اس کی۔

''سلاگودی۔''(رکیں بی بی)

www.novelsclubb.com

ذاکرہ کی روہانسی آواز پہ ایگزٹ کی طرف بڑھتی عائلہ مڑی۔پیچھے ذاکرہ اس کے قدموں سے قدم ملانے کی کوشش میں سارے شاپر گرا بیٹھی تھی اور ان سے ا مڈتے کپڑوں کے ڈھیر سمیٹتے ہوئے روہانسی آواز میں اسے پکار بیٹھی تھی۔ارد گرد

کے لوگ ان کی طرف متوجہ تھے جن میں سے کچھ ذاکرہ کی ٹھیک ٹھاک درگت بننے کے انتظار میں تھے جو کہ عائلہ سید کے بے ساختہ کھلکھلا کے ہنسنے پہ حیران رہ گئے۔عائلہ ہنستی جاتی اور ساتھ میں ذاکرہ کو براہوی میں کہتی جاتی:

"گنوک۔"(پاگل)۔

ذاکرہ حیران دیکھ رہی تھی،اس کی گودی کا کتنا بڑا دل ہے۔ایسا کسی اور کے سامان کے ساتھ کرتی تو اس کا کیا حشر ہوتا اور عائلہ تھی جو ہنس رہی تھی۔اس نے ماتھے پہ بل تک نہ ڈالے تھے۔کیوں؟

ذاکرہ کو خبر نا تھی کہ عائلہ کو اس پہ غصہ اس لیے نہیں آتا تھا کیوں کہ اس کے کانوں میں اپنے مرحوم دادا کے الفاظ آج بھی گونجتے ہیں:

"عائلے میرا بچہ! ہمیشہ یاد رکھنا ذاکرہ تمہاری غلام نہیں،یہ تو اِن کا بڑا پن ہے کہ صدیوں سے خود کو سادات کی خدمت میں وقف کیا ہوا ہے جس طرح ہمارا شجرہ

آقا دو جہاں ﷺ سے منسلک ہے، ایسے ہی ذاکرہ کا شجرہ حضرت بلال حبشی سے منسلک ہے۔ کبھی اِس کا یا ان کے خاندان کا دل ناد کھانا میری گودی، کیوں کہ میرے آقا ﷺ کے بہت پسندیدہ تھے، حضرت بلال۔"

اور 8 سالہ عائلہ کو ذاکرہ کے گھنگریالے بال، چپٹی ناک اور باہر کی طرف نکلے دانتوں کا راز پتا چلا تھا۔ اس نے اپنے دادا کی بات ہمیشہ کے لیے یاد کر لی تھی۔

اگلے ہی پل وہ ذاکرہ کے ساتھ کپڑے سمیٹ کے شاپر اٹھائے ایگزٹ کی طرف بڑھ گئی۔

پیچھے مال میں کئی حیران آنکھیں اس کے حسن سلوک تو کئی اس کی حسین ہنسی کا تعاقب، کرتیں ایگزٹ سے باہر گئی تھیں، جہاں گل محمد سفید پراڈو کا دروازہ کھول رہا تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی عائلہ نے گل محمد کو براہوی میں کیفے کی طرف چلنے کی ہدایات دیں۔وہ پہلے بھی اس کیفے جا چکی تھی۔اس کی کافی اور ڈھلتے سورج کا سمندر کے ساتھ منظر ہی اس کی خاصیت تھے۔

کیفے پہنچ کے گل محمد نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔کالی قندھاری کڑھائی والی چادر کو وقار سے اپنے گرد لپیٹتی،میرون پرنٹڈ قمیص کے ساتھ کالی ٹرائوزر جس کے پائنچوں پہ قمیص کے پرنٹ جیسی کڑھائی،نہایت نفاست سے کی گئی تھی اور کالے سادھے ویلوٹ کے کھسے اپنے بے حد گورے پیروں میں پہنے وہ اتری تو کئی ستائشی نظریں اس پہ گڑھ سی گئیں۔

اس نے اعتماد سے گل محمد کو گاڑی پارک کرنے کا اشارہ کیا اور خود ذاکرہ کو ساتھ لیے آگے بڑھ گئی جو اس کا برانڈڈ سادہ بلیک کلچ اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے کیفے کی طرف چل دی۔

عائلہ کو ہجوم کا اندازہ تھا، مگر جیسے جیسے وہ کیفے کی انٹرنس کے نزدیک ہوتی جارہی تھی اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔اتنا ہجوم اور اتنی خاموشی؟

اسی حیرت میں گھرے وہ دروازے تک پہنچ گئی تھی۔گارڈ نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔اس نے مُسکرا کے شکریہ کہا اور ایک بار پھر کیفے میں پھیلی خاموشی کی طرف متوجہ ہوگئی۔پورا کیفے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، پر سب خاموشی سے ایک گونجتی آواز کی طرف متوجہ تھے۔سب کی نظروں کے تعاقب میں اس نے نظر دوڑائی تو پلکیں جھپکنا بھول گئی۔سفید کاٹن کی شرٹ اور گرے ڈریس پینٹ میں ملبوس، آستینیں کہنی تک چڑھائے، گندم کے سنہرے خوشوں جیسی رنگت، چھے فٹ سے نکلتے قد والا بے حد ہینڈسم شخص تھا۔اس کی شخصیت میں کچھ ایسی انفرادیت تھی کہ وہ کسی سنگِ مرمر کے بت کی طرح دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔اس کے گرد کیا ہو رہا تھا کیا نہیں، اسے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔وہ کیا کہہ رہا تھا اس نے غور ہی نہ کیا۔بس ایک بھاری خوبصورت آواز تھی اور نرم سا لہجہ یا شاید گھنٹیاں تھیں ڈھیروں ننھی

منی گھنٹیاں جو اس کے گرد ٹرانس کی سی کیفیت بنائے ہوئے تھیں۔اس نے اتنی حسین آواز اور اتنا مکمل لب و لہجہ کبھی نہیں سنا تھا۔اس کے دل نے شدید خواہش کی تھی کہ ایک بار بس ایک بار اچٹتی سی ہی صحیح وہ اس پہ نگاہ تو ڈالے، یہ خواہش وہ لڑکی کر رہی تھی جس کی طرف اُٹھنے والی ہر نظر کو پابند کر دیا جاتا تھا۔

اس کے دل نے گڑگڑا کے اس کی ایک نظر مانگی تھی۔پر اس کی چمکتی آنکھیں اس پر اٹھتی ہی نہ تھیں۔اس کے دل نے پھر ضد کی تھی۔پر وہ اب شاید جانے لگا تھا، لوگوں سے مصافحہ کرتا، وہ مُسکرا مُسکرا کے داد سمیٹ رہا تھا۔اسے اپنا دل اداس ہوتا محسوس ہوا۔وہ جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا، تو اس کا دل پھر گڑگڑایا۔

"یااللہ ایک بار بس۔"

www.novelsclubb.com

پر وہ نہ مڑا نہ اس پہ نگاہ ڈالی اور چلا گیا۔اس کے جاتے ہی جیسے پورا کیفے جاگ گیا یا شاید یہ عائلہ سید کے حواس تھے جو بحال ہوئے تھے۔شعور کی دنیا میں آتے ہی اس کی پہلی نظر ذاکرہ پہ پڑی جو حیران اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔عائلہ

نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود متذبذب سی پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئی۔

یہ تھی عائلہ سید کی عبداللہ سے پہلی اور مختصر ترین ملاقات۔

اس دن سے عائلہ کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی، وہ تھا کہ اس کے دماغ سے جاتا ہی نہ تھا وہ قابض تھا اس کے دل دماغ اور ہوش و حواس پہ۔

آج اگر وہ عمران خان سے اس کا نہ پوچھتی تب بھی اس نے طے کر لیا تھا کہ روز یہاں آ کے اس کا انتظار کرے گی۔ ایک ہفتہ تو کیا وہ پوری زندگی اس کیفے میں اس کی ایک جھلک کے انتظار میں گزار دے۔

عائلہ گلاس وال کے پار ساحل پہ سر پٹختے سمندر کی لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ آج وہ اکیلی آئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ذاکرہ یا اماں اسے اس طرح عبداللہ کے پیچھے خوار ہوتے دیکھ کوئی غلط مطلب لیں۔ عائلہ کوئی فیری ٹیل میں رہنے والی لڑکی نہ

تھی،اسے اچھے سے اندازہ تھا کہ محبت ان کے قبیلے میں مرد عورت دونوں کے لیے وہ ممنوع علاقہ تھی جس پر قدم دھرنے کی سزا موت تھی۔پر وہ چاہتی تھی محبت کرے،وہ چاہتی تھی اس میٹھے احساس کو محسوس کرے،اسے پتا تھا محبت کو پانا جرم تھا،قبیلے سے بغاوت کرنا جرم تھا،پر اس محبت کو دل میں چھپانا تو جرم نہ تھا۔

سمندر پہ ٹکی اس کی برائون آنکھوں میں ایک چمک ابھری تھی۔ہاں! صرف اپنے دل میں اس کی محبت چھپا لینا کیسا جرم کیسا دھوکا؟

سید زادی ایسی محبت تو کر سکتی ہے۔وہ مُسکرائی اور خود کو تسلی دیتے ہوئے اپنی کافی کی طرف متوجہ ہوئی۔

www.novelsclubb.com

"السلام و علیکم!"

عائلہ سید ٹھٹکی اس نے اِدھر اُدھر،اس بھاری خوبصورت آواز کے تعاقب میں حیران نظریں دوڑائیں۔بالکل ویسے جیسے پیاسا پانی کی تلاش میں دیکھتا ہے۔

اپنے مخصوص کونے میں کالی شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک فولڈ کیے،اپنے خاص انداز میں ابتدائیہ کلمات کہتا وہ عبداللہ ہی تھا۔

عائلہ کو لگا جیسے سب کچھ رک سا گیا تھا۔کیفے کی دیوار پہ ٹنگی وہ بڑی سی کالی گھڑی، وہاں موجود بولتے لوگ،دیوار پار آتی جاتی سمندر کی لہریں،اپنی کافی میں چمچ گھماتا اس کا ہاتھ،کافی کے کپ سے اُٹھتا دھواں،اُس کی سانسیں،اُس کی دھڑکن اور اُس کی آنکھیں۔اسے اپنے ارد گرد کا ماحول تحلیل ہوتا محسوس ہوا۔اسے لگ رہا تھا اس کے گرد کوئی نہ تھا،کوئی آواز نہ تھی۔تھا تو صرف عبداللہ جو اسے بولتے ہوئے دکھائی اور سنائی دے رہا تھا۔

عائلہ اپنی پلکیں جھپکنے سے بھی ڈر رہی تھی کہ کہیں،عبداللہ اس کی نظروں سے دور نہ ہو جائے۔اسے سانس لینے سے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ سانس لے اور عبداللہ کی آواز آنا بند ہو جائے۔

وہ آج ایک انگلش ناول کا خلاصہ دے رہا تھا جو مولانا رومی کی ذات پہ مبنی ہے۔وہ کچھ اقتباسات پڑھ رہا تھا،اپنی ذاتی رائے پیش کر رہا تھا۔

پورے کیفے میں ہو کا عالم تھا،کیوں کہ جب عبداللہ بولتا،تو صرف وہی بولتا اور باقی سب سنتے۔اس کا لب و لہجہ،آواز،انداز،ہر ہر بات سے خود اعتمادی ٹپک رہی تھی۔ اس کا یہ انداز کسی کو بھی کتابوں اور ادب کی طرف راغب کر سکتے تھے پھر وہ تو عائلہ تھی جو اس کے قدموں میں اپنا دل،اپنا قیمتی دل،اس کی ایک نظر کے عوض رکھنے کو تیار تھی اور خود.....

---

www.novelsclubb.com

#عشق_لا

فریال سیّد

قسط نمبر 2

کتنا خوش قسمت تھا وہ گول مٹول سادہ سا پٹھان لڑکا، عبداللہ کا چہیتا۔ اس کا معصوم چہرہ جس پہ عبداللہ نظریں ڈالتا تھا، اس کی آواز جسے عبداللہ سنتا تھا، اس کے ہاتھ جو عبداللہ کے ہاتھوں کو مصافحہ کے لیے چھوتے تھے، سب کتنے قیمتی تھے۔

اسے دور کافی کائونٹر سے کپ اٹھاتا عمران خان سونے کا بنتا دکھائی دیا، وہ سونے کا ہی تو تھا۔ عبداللہ، پارس تھا جسے چھو لے سونا کر دے۔

www.novelsclubb.com

"السلام علیکم باجی۔"

عمران خان کے سلام کرنے پہ وہ بری طرح چونکی تھی۔ عمران خان ہمیشہ کی طرح اس کی مخصوص کافی اور ذاکرہ کی چائے، سینڈوچز، بنا آرڈر کیے ہی لے آیا تھا۔ عائلہ کو تھوڑی دیر ہی لگی تھی حواس بحال کرنے میں:

"وعلیکم السلام! کیسے ہو عمران خان، بہت شکریہ کافی کے لیے۔"

عمران خان سے کافی لے کے رکھتی ذاکرہ کے لیے یہ نرم لہجہ نیا نہ تھا۔ اس کی گودی ہر دفعہ ہی عمران خان سے اتنی ہی نرمی سے مخاطب ہوتی۔

پشتولب ولہجے میں اردو بولتے عمران خان نے جوش سے جواب دیا:

"میں ٹھیک ہوں باجی، آپ کی مہربانی۔" اور آگے بڑھ گیا۔

www.novelsclubb.com

عائلہ، عمران خان کی پیٹھ پہ نظریں جمائے اپنے دل میں ہی عبداللہ سے مخاطب ہوئی تھی:

"تم جس سے ہنس کر ملتے ہو میں اس کو دوست بناتی ہوں، میں ایسی محبت کرتی ہوں، تم کیسی محبت کرتے ہو؟"

محبت...

وہ ٹھٹکی۔

اور عبداللہ کو؟

کیا وہ بھی مجھ سے؟

تلخ طنزیہ مُسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔

ذاکرہ نے حیرانگی سے اس کے بدلتے تاثرات دیکھے۔

www.novelsclubb.com

خود کو حیرت سے تکتی ذاکرہ کو دیکھ کے وہ سنبھلی، پر محبت سنبھلنے کہاں دیتی ہے؟

اس کی کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ کیفے میں داخل ہوتا عبداللہ، ہلکی نیلی شرٹ میں سنہرے دمکتے چہرے پہ دھوپ جیسی مُسکراہٹ سجائے، سورج ہی تو لگ رہا تھا۔

عائلہ کا ہونٹوں کی طرف کافی کا کپ لے جاتا ہاتھ ہلکا سا کانپا۔ کافی ہلکی سی چھلکی تھی شاید، ذاکرہ نے اسے کچھ کہا تھا۔ پر اسے ہوش کہاں رہا تھا۔ اسے اپنا دل اپنے کانوں میں دھڑکتا محسوس ہوا وہ بھی صرف تب تک جب تک عبداللہ سکندر کی آواز اس کیفے میں نہ گونجی تھی۔

اس کی آواز، ہیملن کے پائیڈ پائپر کی انوکھی دھن تھی اور عائلہ ہیملن کے بچوں کی طرح تھی، جنہیں پائیڈ پائپر کی دھن نے ہپناٹائز کر کے ہمیشہ کے لیے ان کے والدین سے دور کر دیا تھا۔ عبداللہ کی آواز بھی جب گونجتی تو انسان کا خرد سے تعلق کہاں رہنے دیتی۔

اس چھے ماہ کے عرصے میں اتنا ضرور ہوا تھا کہ بے ادب عائلہ کو ادب سے شغف ہو گیا تھا۔ اب اکثر وہ عبداللہ کی تجویز کردہ کتابوں کے علاوہ بھی اردو ادب پڑھنے لگی تھی۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ اردو زبان میں بڑے بڑے ماسٹر پیس موجود تھے۔

شہاب نامہ سے لے کر راجہ گدھ، عشق کا عین سے لے کر پیرِ کامل، پیار کا پہلا شہر

سے لے کر سفید گلاب، مصحف سے لے کر ہم جان، خدااور محبت سے لے کر ایک محبت اور سہی، اس نے اردو کے کئی شاہکار پڑھے۔ادب کے بے تاج بادشاہوں کو پڑھا۔اس بے ادب لڑکی کو عبداللہ کے ادب سے عشق ہو گیا تھااور ادب نے اس کے بند ذہن کے کئی در وا کیے تھے جس کا سہرا عبداللہ کے سر ہی جاتا تھا۔آج عبداللہ کس کتاب کو موضوع بنائے گا۔عائلہ سید تجسس میں ٹکٹکی باندھے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

عبداللہ تعارفی کلمات بول چکا، تو اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب کھول کے اس میں سے اپنے پسندیدہ اقتباس پڑھنے لگا۔کیفے پہ پراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔اتنی خاموشی کے کیفے کی دیوار پہ ٹنگی اس بڑی سی کالی گھڑی کی ٹک ٹک کسی چرچ کے بڑے سے گھنٹے کی ڈنگ ڈنگ کے موافق لگ رہی تھی۔عبداللہ بولنے لگا تو عائلہ کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔یہ اس کے پسندیدہ ترین ادیب کے صدارتی انعام یافتہ ناول کے اختتام کے خوبصورت ترین جملے تھے۔

www.novelsclubb.com

عائلہ نے یہ حسین اختتام جانے کتنی دفعہ پڑھا تھا کہ اسے ایک ایک لفظ ازبر تھا۔ عبداللہ جو بول رہا تھا اسے یاد تھا جو بولنے والا تھا اسے پتا تھا۔ عائلہ کے لب عبداللہ کے لبوں کی جنبش کے ساتھ ہل رہے تھے۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہاشم ندیم خان کی عبداللہ ''کھولے۔

عبداللہ بولا: ''دور سمندر کے اس پار افق پر سورج ڈوب رہا تھا۔ میں نے قدم بڑھا دیے اور زہرا میرے پیچھے چل پڑی۔ ''میرے نقشِ پا پر اپنے نازک قدم دھرتی۔ پہلی مرتبہ عبداللہ اور زہرا کو ایک ساتھ اس ڈگر پر چلتے دیکھ کر لہریں مُسکرائیں اور ڈوبتے سورج نے کہا ''نئی مسافتیں...نئے سفر اور نیا ہم سفر مبارک ہو دوست۔ آنے والی سحر کے ساتھ اک نئے آسمان کا سلام اور اس ڈھلتی شام کی جانب سے تمہیں الوداع...الوداع عبداللہ...الوداع۔''

وہ بول رہا تھا یا صور پھونک رہا تھا عائلہ کو اپنی سماعت پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے یہ ناول اِس کے نام ''عبداللہ'' کی وجہ سے ہی پڑھا تھا پر اسے اندازہ نہ تھا کہ یہ

کتاب اس کی پسندیدہ ترین کتاب بن جائے گی۔اس نے یہ کتاب لگاتار کئی مرتبہ پڑھی تھی اور آج عبداللہ سکندر اس سے اقتباس پڑھ کے عائلہ کو دیوانہ ہی تو کر گیا تھا۔

عائلہ دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی کہ تالیوں کے شور نے اس کے خیالوں کے تسلسل کو توڑا۔

عبداللہ داد سمیٹتا، لوگوں کے جھرمٹ میں سورج کی طرح چمک رہا تھا۔ ہجوم کچھ کم ہوا، تو وہ اپنی مخصوص ٹیبل پہ جا کے بیٹھ گیا۔ عمران خان جلدی جلدی اس کی مخصوص کافی لایا۔ شکریہ کہتے ہوئے عبداللہ مُسکرایا۔

عائلہ کا دل زور سے دھڑکا، ایسی مُسکراہٹ کیا کسی اور کی ہو سکتی ہے؟

اس کے دل نے نفی میں سر ہلایا۔

کچھ تو خاص تھا اس میں جو عائلہ کو مقناطیس کی طرح اپنی اور کھینچتا تھا۔ عائلہ کی نظریں اب بھی عبداللہ کے گرد طواف کر رہی تھیں اور عبداللہ کی نظریں تھیں کہ اس پر اُٹھتیں ہی نہ تھیں۔ عائلہ اس کی نظر کی بھیک مانگ مانگ کے تھکنے لگی تھی۔ دل تھا کہ مسلسل بغاوت پہ مائل تھا اور دماغ اسے اس کا مقام، روایات اور اقدار یاد کرا کے روک رہا تھا۔

ذاکرہ کو یکسر فراموش کیے اس کی نگاہیں اب بھی عبداللہ کے گرد کسی دھمال کرتی حسینہ کی طرح، بال کھولے، گول دائروں کی صورت گھوم رہی تھیں۔

ذاکرہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی گودی کی نظروں میں دیکھا۔ ہیزل آنکھیں لال ڈوروں میں پگھلتیں نظر آئیں۔ ذاکرہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ عائلہ کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ضد اور بغاوت کی جیت ہو چکی تھی۔ دماغ، اقدار اور روایات کی تو محبت میں ہمیشہ سے ہار ہوئی ہے، یہ پہلی دفعہ تو نہیں۔ پر ایک سید زادی کی بغاوت، ان کی آنے والی سات پشتوں تک کو ہلا دیتی ہے۔ اِس سے پہلے

کہ ذاکرہ ہمت باندھتی کچھ کہنے کو، عائلہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور بنا پیچھے دیکھے، عبداللہ کی ٹیبل پہ اس کی سامنے والی کرسی پہ جا بیٹھی۔

ذاکرہ کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

عائلہ سید کی ضدی نظریں اب بھی عبداللہ پہ مرکوز تھیں، پر عبداللہ نے کتاب سے آنکھیں نہ ہٹائیں۔

عائلہ تھوڑا سا کھنکاری۔

دو کالی چمکدار ذہین آنکھیں اس پہ اٹھی تھیں۔

اُف! اِسی ایک نظر کی چاہ نے تو عائلہ کو باغی کر دیا تھا۔

www.novelsclubb.com

نظریں تھیں کہ کسی جادوگر کا سحر، عائلہ سب بھول بیٹھی۔ عبداللہ سکندر کی آنکھوں میں سوال ابھرا، عائلہ نے نظریں جھکائیں۔ گلے میں پھنسے لفظوں اور اتھل پتھل سانسوں کو قابو میں کیا پھر بہ مشکل عبداللہ سے پوچھا: ”وہ میں پوچھنا

چاہ رہی تھی کہ...آپ نے اس کتاب کا ہی انتخاب کیوں کیا اور اس کتاب کی ان ہی سطروں کو کیوں چنا؟"

عبداللہ کی شرارت بھری نظروں سے نظریں چراتے ہوئے، اپنی بات مختصر کی اور اپنے کانپتے ہاتھوں کو اپنی گود میں رکھتی عائلہ کی ضد اور بغاوت ہوا ہو چکی تھی۔ وہ اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے عبداللہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے ذاکرہ کا خیال آیا جس کی طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی، اس کی کیا حالت ہو گی عائلہ کو اچھے سے اندازہ تھا۔

یااللہ! یہ میں نے کیا کر دیا۔ خشک گلے کو تر کرنے کی کوشش میں وہ کئی دفعہ تھوک نگل چکی تھی۔ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں پہ نظریں جمائے جانے اسے کتنی دیر ہو گئی۔ پر عبداللہ کچھ نہ بولا۔ اس نے جھنجھلا کے نظریں اٹھائیں۔

انہماک سے گھبرائی ہوئی عائلہ کو دیکھتا عبداللہ ہڑبڑایا تھا۔ پھر خود پہ قابو پاتے ہوئے، اگلے ہی لمحے کتاب پہ اپنے ہاتھ جماتا، اعتماد سے عائلہ کے سوال کا جواب دیا:

"یہ کتاب اس لیے چنی کیوں کہ یہ میری پسندیدہ ترین کتاب ہے بلکہ وہ پہلی کتاب ہے جس نے مجھ جیسے بے ادب کو باادب بنادیا۔ میں یہ سوچتا ہوں بلکہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ ناول "عبداللہ" کو پڑھنے والا خود کو کبھی عشق کرنے سے نہیں روک سکتا خواہ وہ عشقِ مجازی ہو یا عشقِ حقیقی اور میں چاہتا ہوں آج کل کے اس مشینی دور میں بھی لوگ عشق کریں۔ سچا عشق، لازوال عشق۔"

وہ خاموش ہوا تو اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ جمائے کسی سنگِ مرمر کے مجسمے کے مانند ہمہ تن گوش عائلہ نے حرکت کی تھی۔ اب کہ اپنی شہادت کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے وہ بولی:

"میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ بالخصوص یہی سطریں کیوں؟"

اس کا صاف لب ولہجہ عبداللہ کو متاثر کیے بنا نہ رہ سکا۔ چار سے پانچ مقامی زبانیں بولنے والی لڑکی کی اردو حیرت انگیز طور پر نہایت صاف تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں مزید سوچتا نظریں جھکائے بیٹھی عائلہ نے ہلکا سا کھنکار کے اُسے اپنے سوال کی طرف متوجہ کیا۔

عبداللہ بولا:

"ان سطروں کا انتخاب میں نے دو وجوہات کی بنیاد پہ کیا ہے۔ پہلی، کیوں کہ اس سے خوب صورت اور مکمل اختتام میں نے آج تک کسی کتاب کا نہیں پڑھا۔ مجھے ان سطروں سے محبت ہے، مجھے عبداللہ کی کہانی سے محبت ہے اور مجھے سمندر پہ کیے گئے اس حسین سے اقرار سے محبت ہے۔"

وہ ایک ثانیے کو رکا۔ عائلہ سید کی جھکی لمبی پلکیں اٹھیں۔

یہی پل تھا جب دو کالی ذہین آنکھوں میں اس کی دو چمکتی حیران بھوری آنکھوں کا عکس ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا۔

عبداللہ سکندر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہا:

"اور دوسری وجہ زہرا ہے اس کتاب کی زہرا۔ عبداللہ کی زہرا۔ عشق ہے مجھے اس سے۔ جب بھی اختتام پہ عبداللہ اور زہرا کی لازوال محبت کے وصل کو پڑھتا ہوں، تو لگتا ہے ایسے ہی ایک دن میری زہرا بھی سمندر کنارے، ڈوبتے سورج کے وقت مجھ سے آملے گی یا..."

لہجہ مزید گہرا اور نظریں مزید اس پہ گڑی تھیں۔

"یا... شاید مل ہی گئی ہے۔"

عائلہ کو لگا جیسے وقت تھم گیا، اس کی سانسیں، اس کی دھڑکن، اس کا دماغ۔ خیر دماغ تو کب کا تھم چکا تھا۔ محبت کی آمد اور دماغ۔

محبت کے آتے ہی سب سے پہلے عقل ہی تو ناک منہ چڑھائے جاتی نظر آتی ہے۔

عائلہ اس کے محتاط لفظوں کے پیچھے چھپے اظہار کو سمجھ رہی تھی۔

جانے کتنی دیر گزر گئی عبداللہ سکندر کی کالی آنکھیں، عائلہ سید کی گلابی آنکھوں پہ ٹھہری ہوئی تھیں۔

بے شک وہ لفظوں کا جادو گر تھا۔عائلہ سید اس کے لفظوں کے طلسم میں ڈوب چکی تھی۔اس کا دل اظہار کے لیے مچلا تھا۔

دل...

ہائے دل...

عجیب دل...

عجیب کی چاہ کرنے والا دل...

www.novelsclubb.com

اس کی صابر محبت کو باغی بنانے والا دل اب اس کے سلے ہوئے ہونٹوں سے اظہار چاہتا تھا۔

تم سید زادی ہو، یہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔دماغ جاگا تھا۔

کیاسید زادیاں محبت میں اظہار نہیں کرتیں؟دل نے سر دھنا تھا۔

نہیں...سید زادیاں تو محبت ہی نہیں کرتیں۔خدارا جاگ جائو عائلہ۔ سنبھل جائو عائلہ۔تم سنڈریلا ہو،یہ اظہار تمہارے بارہ بجے۔ادھر تم اظہار کرو گی اورادھر بارہ بج جائیں گے اور سب ختم۔

کیا خبر اسے تم سے محبت نہ ہو؟اس کے لفظوں کے معنی عام سے ہوں؟

پھر؟

یہ آخری بھرم بھی تمہارے پاس نہ رہا،تو؟

دماغ کی آخری دلیل پہ انا نے بھی سر اٹھایا تھا۔عبداللہ سکندر کی کالی آنکھوں کی تپش میں تپتی عائلہ سید نے پلکیں جھپکیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ کے تیز تیز قدم اٹھاتی باہر کی اور بڑھ تھی۔

عبداللہ سکندر حیران وہیں بیٹھا رہ گیا۔

اس نے عائلہ کی ٹیبل کی طرف نگاہ کی تو حیران پریشان ذاکرہ کبھی اسے تو کبھی دروازے کی طرف بڑھتی عائلہ کو دیکھ رہی تھی۔

عائلہ کی کافی کا آدھا کپ،اس کا فون،والٹ اور ذاکرہ،اس اچانک افتاد پر حیران ٹیبل پہ ہی اس کا انتظار کر رہے تھے اور وہ کیفے سے باہر جا چکی تھی۔

دور کھڑے دیکھتے،عمران خان نے عبداللہ کو بھی باہر جانے کا مشورہ اشاروں میں دیا۔عبداللہ نے پر سوچ نگاہوں سے گلاس وال کے پار نظر آتے عائلہ کے ہیولے کو دیکھا۔اسے ایک لمحہ لگا تھا فیصلہ کرنے میں۔اگلے ہی پل کیفے میں موجود بہت سے لوگوں کے دلوں کی دھڑکن،عبداللہ سکندر تیزی سے اٹھا اور دیوانہ وار بھاگتے عائلہ سید تک پہنچا تھا۔

www.novelsclubb.com

پارکنگ لاٹ کے سامنے،بے چینی سے چہل قدمی کرتی عائلہ کو گاڑی کا انتظار تھا۔ اپنی طرف تیزی سے آتے عبداللہ کو دیکھ اس نے رخ موڑا ہی تھا کہ ایک جھٹکے سے

رکی اور اگلے ہی پل واپس مڑے، حیران آنکھوں اور نیم وا لبوں سے اپنا ہاتھ عبداللہ کی مضبوط انگلیوں کے حصار میں دیکھ رہی تھی۔

گرے چادر سر سے سرک کے کاندھوں پہ جھول رہی تھی۔ برائون بال چہرے پر اڑ رہے تھے اور اس کی ناک کا ہیرا سورج کی روشنی میں دمک رہا تھا۔

جانے کون سا جذبہ تھا جو اُس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔ حواس باختہ عائلہ نے کیفے کی طرف دیکھا۔

فق چہرہ لیے اس کا سامان اٹھائے ذاکرہ گلاس وال سے نیچے عائلہ ہی کو دیکھ رہی تھی۔

کیفے کی سیڑھیوں پہ کھڑا عمران خان بھی ان ہی کو دیکھ رہا تھا۔ عائلہ کو اپنے طرف دیکھتا پا کے جانے کیوں وہ سر جھکا کے اپنا چہرہ چھپا گیا۔

عائلہ کی حیران نگاہیں پھر عبداللہ تک آئی تھیں جو آنکھوں میں محبت کے ہزاروں رنگ سجائے،اس کے چہرے کو ہی تک رہا تھا۔

عائلہ کی سہمی نظریں اپنے ہاتھ پہ گئیں جواب بھی عبداللہ کے سنہرے ہاتھ میں موجود ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے گندم کے خوشے پہ گلابی گلاب کا پھول کھل گیا ہو۔

عائلہ چاہتی تھی اسے کہے،میرا ہاتھ چھوڑو مجھے نہ چھو،میں سید زادی ہوں،تم نا محرم ہو۔

عائلہ چاہتی تھی اپنی چادر سر پہ اوڑھے،اس کے بال جو چہرے پہ بکھرے تھے انہیں چھپائے،وہاں سے دور چلی جائے،مگر عائلہ کے پاس بھی تو ویسا ہی دل تھا جیسا ہر عام لڑکی کے پاس ہوتا ہے۔وہ بھی ہر عام لڑکی کی طرح محبت کا اظہار چاہتی تھی،وہ بھی ہر عام لڑکی کی طرح اس لمحے کی گہرائی میں کھو چکی تھی۔

پھر مقابل بھی تو عبداللہ تھا۔اس کی چھوٹی سی محبت کے جہاں کا سورج عبداللہ، جس کی ایک نظر کی بھیک وہ شب کی نمازوں میں مانگتی رہی تھی۔وہ اس کے سامنے تھا تو کیوں نہ عائلہ کے حواس سلب ہوتے؟

عبداللہ کی نگاہیں ''می رقصم می رقصم'' کا ورد کرتیں عائلہ کے گلابی چہرے پہ گھوم رہی تھیں۔

وہ اس کا ہاتھ، ہاتھ میں تھامے، گھٹنوں کے بل اس کے قدموں میں جھکا اور وہیں گھٹنے ٹیکے بیٹھ گیا۔

''میں عبداللہ سکندر اپنے تمام تر ہوش و حواس میں، آج اس سمندر اور ڈوبتے سورج کو حاضر و ناظر مانتے ہوئے یہ اقرار کرتا ہوں کہ میں اپنا تن من دھن، اپنی روح، اپنا سب کچھ، عائلہ ابراہیم سید پہ پہلی نگاہ پڑتے ہی ہار بیٹھا تھا۔''

"ان چھے ماہ میں خدا گواہ ہے کہ میرا ایک بھی پل آپ کی یاد سے غافل نہیں رہا عائلہ۔اس دن،اس پہلی نظر ہیمیں، میں نے اپنے دل کو تمہارے ان خوبصورت قدموں کے ساتھ جاتا محسوس کیا تھا۔اگر مجھے عمران خان تمہارے خاندان اور اس کی روایات کا نہ بتاتا، تو میں کبھی اپنی محبت کو اتنے عرصے تک پتھر کی دیواروں میں نہ چنتا۔"

عائلہ نے آنکھ اٹھا کے دور کھڑے عمران خان کو دیکھا، وہ بھی اُسے کو دیکھ کے مُسکرایا تھا۔

عائلہ کی نظر ذاکرہ پہ نہیں گئی تھی جو ہاتھ ہلا ہلا کے اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ اسے بتا سکے کہ اس کے فون پہ بار بار میر صاحب کی کال آ رہی تھی۔

عائلہ کی نظر عمران خان سے ہوتے ہوئے عبداللہ پہ آ کے رکی۔سورج کی نارنجی شعاعیں اس کے چہرے کو یونانی دیوتاؤں جیسا غرور بخش رہی تھیں۔وہ مزید گویا

ہوا: ”عائلہ میں تمہاری اتنی عزت کرتا ہوں کہ میرا بس چلے تو میں کسی کو منہ اٹھائے تمہارا نام تک نہ لینے دوں، کجا تمہیں دیکھنا؟ میں نے اپنی بھی ہر ہر نگاہ کو تمہاری طرف اُٹھنے سے اسی لیے روکا تھا، ورنہ اس پہلی نظر ہی میں میں پہچان گیا تھا کے تم ہی میری زہر اہو۔“

عائلہ کی آنکھوں میں کچھ آنسو چمکے تھے۔ چھوٹی سی ناک لال ہوئی تھی اور ہونٹوں پہ مُسکراہٹ تھی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی اتنا حسین اقرار اور وہ بھی عبداللہ کی زبانی اس کی خوبصورت آواز میں سننے کی امید نہ رکھی تھی۔ عائلہ کی آنکھوں سے دو آنسو بہے تھے۔

عبداللہ ایک دم سے اوپر ہوا۔ عائلہ کے مدِ مقابل کھڑے ہوتے، اس نے تھوڑا سا جھک کے اس کی بھوری آنکھوں میں جھانکا۔ عائلہ اچھے قد و قامت کی حامل تھی پھر بھی عبداللہ کے بہ مشکل کندھے تک آتی تھی۔ تبھی اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے لیے عبداللہ کو تھوڑا سا سر کو خم دینا پڑا۔ اس کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو تھے۔

اسے لگا کے عائلہ ڈر گئی اس کی بے قراریاں دیکھ کے سن کے۔

عبداللہ پہ شرمندگی کا غلبہ شدید تھا۔

شرمندگی کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ بِنا کچھ کہے جانے کے لیے پلٹا۔ ابھی دو قدم ہی اُٹھائے تھے اس نے کہ پہلی دفعہ اس نازنین کی، ہوا کے دوش پر کسی مترنم رباب جیسی آواز نے ہوا میں سر بکھیرے تھے۔ واپسی کے لیے قدم بڑھاتے عبداللہ کے پیروں کو زمین نے جکڑا تھا۔

سامنے سے آتی ذاکرہ جو عائلہ کے فون پر بار بار چمکتی میر صاحب کی تصویر دیکھ کے عائلہ کو اس کا فون دینے آ رہی تھی، عائلہ کی آواز سن کے پتھر کا مجسمہ بن گئی۔

عائلہ بھیگی آواز میں کہہ رہی تھی:

www.novelsclubb.com

"میں عائلہ ابراہیم سید، اپنی تمام تر خاندانی روایات، قبائلی اقدار، ذات پات کے ہر فرق، بچپن سے لگی ہر پابندی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ اقرار کرتی ہوں کہ ان

چھے مہینوں میں میرا دل صرف عبداللہ سکندر کے لیے دھڑکا ہے۔میری ہر آتی جاتی سانس نے عبداللہ کے نام کی تسبیح کی ہے۔میری سماعتوں نے ہر پل عبداللہ کی ہی آواز سننے کی دعا کی ہے۔میں نے ہر فرض اور نفلی عبادات کے بعد عبداللہ سکندر کی ایک نظر کی بھیک مانگی ہے۔اِن چھے مہینوں میں، محبت نے مجھے کب عائلہ سید سے عبداللہ سکندر بنادیا مجھے خود بھی احساس نہیں مگر ہاں!

"مجھ سے زیادہ محبت عبداللہ سکندر سے اس روئے زمیں پہ کوئی نہیں کر سکتا۔کوئی بھی نہیں، مر کر بھی نہیں۔"

سورج سمندر میں ڈوبنے کو تیار تھا۔اس کی شعاعیں لال رنگ میں ڈھل چکی تھیں۔

www.novelsclubb.com

اتنے حسین اور کامل اقرار کی امید صرف اتنے ہی حسین اور کامل چہرے سے کی جا سکتی ہے۔عبداللہ اس دلکش ڈھلتی شام اور عائلہ کے خوبصورت اقرار کے زیرِاثر جانے کتنی دیر یونہی چہرہ موڑے کھڑا رہا۔

عائلہ کی نظریں اس کی چوڑی پیٹھ پر کسی ردِ عمل کے انتظار میں گڑھی تھیں۔

ذاکرہ اِس پر اثر لمحے کے زیرِ اثر بت بنی کھڑی تھی۔

عمران خان اب بھی کیفے کی سیڑھیوں پہ کھڑا، دور ہی سے سہی اس لمحے کی نزاکت کو محسوس کر سکتا تھا۔

عائلہ کی آنکھوں سے اب بھی آنسو رواں تھے۔

عبداللہ دھیرے سے پلٹا۔

دور کھڑی ذاکرہ کے ہاتھ میں عائلہ کا فون پھر سے بجا تھا۔ میر صاحب کی تصویر دیکھ کے، ذاکرہ نے فکر سے لال آنسوئوں سے تر اپنی گودی کے چہرے کو دیکھا جسے اس وقت کچھ یاد نہ تھا، یاد رہا تھا تو صرف عبداللہ۔

www.novelsclubb.com

روئی روئی آنکھوں والی عائلہ کی چھوٹی سی ناک بے حد لال ہو رہی تھی۔ عبداللہ کے تاثرات جانچتے اس کے چہرے پہ اب بھی دو آنسو بہے تھے۔

عبداللہ نے کالی آنکھوں میں محبت کا جہاں بسائے اس کی شہد جیسی آنکھوں میں جھا نکا اور دھیرے سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسے رونے سے روکا تھا۔

عائلہ روتے روتے مُسکرادی۔

عبداللہ نے اپنا ہاتھ دھیرے سے اس کے رخسار پہ رکھا اور نہایت نرمی سے دونوں آنسو چنے تھے۔ لمبی پلکیں جھکی تھیں۔ حیا کی لالی نے رخسار دمکائے تھے۔ جھکی پلکیں پھر سے اٹھی تھیں۔

اپنی پوروں پر سجے دو ننھے کوہِ نور عبداللہ نے اپنی شرٹ پہ سیدھے دل کی جگہ رکھے تھے۔

سورج کی الوداع کہتی کرنوں نے ان دونوں کے وجود کو چھوا تھا۔ اس سے مکمل شام نہ عائلہ کی زندگی میں کبھی کوئی آئی تھی نہ کبھی کوئی آنی تھی۔

وہ سب بھلائے صرف اس پل کو جی رہی تھی، جب اس کی نظر عبداللہ کی پشت پر سے، اپنی طرف بھاگتے ہوئے آتی ذاکرہ پہ گئی۔ ذاکرہ بھاگ رہی تھی اور اسے کوئی اشارہ کر رہی تھی۔ عائلہ نا سمجھی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عائلہ کے نظروں کے تعاقب میں عبداللہ بھی، اپنی طرف تیزی سے آتی ذاکرہ کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک زناٹے دار تھپڑ کی آواز پہ حیران پلٹا۔

عائلہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے گال پہ ہاتھ رکھے، سامنے کھڑے اس سفید کاٹن کے سوٹ میں ملبوس بارعب شخصیت کو دیکھ رہی تھی۔ عبداللہ کو کچھ سمجھ آ رہی تھی اور کچھ نہیں۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے عائلہ کو دیکھا۔ کیا وہ عائلہ ہی تھی، تھوڑی دیر پہلے والی عائلہ؟

www.novelsclubb.com

اسے لگا جیسے عائلہ کو موت کا فرشتہ دکھ گیا ہو۔ جیسے اس کے جسم سے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ وہ سامنے کھڑے شخص کو شدید ترین خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جب کہ مقابل کی قہر برساتی نگاہیں عائلہ کے چہرے سے ہوتے ہوئے عبداللہ کے

چہرے پہ آئی تھیں۔ بھوری قہر آلود آنکھوں نے سب بھید کھول دیے تھے۔ ہو بہو عائلہ جیسی آنکھیں رکھنے والا وہ شخص یقیناً عائلہ کے والد تھے۔

عبداللہ کی نظریں احساس جرم سے جھکی تھیں۔

جب کہ قہر برساتی نگاہوں کی تپش اب بھی وہ خود پہ محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے جھکی نظریں اٹھا کہ عائلہ کو دیکھنا چاہا۔

گلابی رنگت والی عائلہ کا رنگ خطرناک حد تک سفید ہو چکا تھا۔ گال پہ تھپڑ کا گلابی جلتا ہوا نشان عبداللہ کے دل کو کاٹ گیا۔ عائلہ دیوانہ وار عبداللہ کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں چیخ چیخ کہ عبداللہ سے الوداع کہہ رہی تھیں۔

عبداللہ دیکھ رہا تھا، جب جب عائلہ کی سہمی ہوئی نظریں اس کے چہرے سے ہوتے ہوئے میر صاحب کے چہرے پہ جاتیں، اس کا پورا وجود کانپ جاتا۔ میر ابراہیم سید کے چہرے پر بے انتہا غصہ، جلال اور نفرت تھی۔ ان کی آنکھوں میں سرد سی بے

حسی تھی جو عبداللہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر رہی تھی۔ابھی وہ میر ابراہیم سید کے جلال کو پرکھ ہی رہا تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے مڑے اور پارکنگ لاٹ میں اپنی گاڑی کے پیچھے کھڑی گارڈز کی گاڑی میں بیٹھے گارڈز کو کسی مقامی زبان میں کچھ کہا۔پھر زہر آلود نگاہوں سے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے عائلہ کا بازو سختی سے پکڑ کے اسے گھسیٹا۔

عائلہ نے جراح کی تھی جس کی سزا کے طور پر ایک اور زناٹے دار تھپڑ نے اس کے ہونٹ کو زخمی کر دیا۔اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں سے رستا خون اس کی ٹھوڑی پہ چمکتے بھورے تِل کو بھی خون آلود کر گیا جو تھوڑی دیر پہلے اس کے مُسکراتے ہونٹوں کے ساتھ مُسکرا رہی تھی۔عبداللہ کو اپنے وجود میں تکلیف کی شدید لہریں دوڑتی محسوس ہوئیں۔

www.novelsclubb.com

عائلہ کی خوف زدہ آنکھیں اب بھی عبداللہ پہ گڑھی تھیں اور بازو میر ابراہیم سید کی گرفت میں تھا۔اب کے اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا، کسی بے جان چیز کی طرح ان کے ساتھ گھسٹتی جارہی تھی۔

عبداللہ کی طرف دو بھدی جسامت اور کرخت چہروں والے گارڈ بڑھے۔عائلہ انہیں دیکھ بے جان ہو کے بیٹھ گئی تھی۔اس کا بازو اب بھی میر صاحب کے ہاتھ میں تھا۔انہوں نے اسے کسی جانور کی طرح گھسیٹا۔عائلہ کی نگاہیں عبداللہ پہ تھیں جو خود کو گرفت میں لیتے گارڈز کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

روتی ہوئی ذاکرہ، گھسٹتی ہوئی عائلہ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔عبداللہ کو قابو کرنے میں ناکام گارڈز سے ہوتے ہوئے عبداللہ کی نظر عائلہ پہ گئی۔کاندھوں پہ جھولتی چادر کب کی زمین پہ گر چکی تھی اور عائلہ کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ یہ وہ عائلہ تھی جس کے چہرے کی ایک جھلک بھی کبھی ان گارڈز نے نہیں دیکھی تھی اور آج انہی کے سامنے عائلہ کی چادر گری تھی۔پتھرائی ہوئی نظروں سے خود

کو دیکھتی عائلہ کامٹی میں اٹاوجود، خون سے بھرا چہرہ، سوجا ہوا زخمی ہونٹ، بکھرے ہوئے لمبے بال اور گری ہوئی چادر دیکھ وہ دیوانہ ہوا تھا۔

اس نے اپنا پورا زور لگا کے خود کو گارڈز کی گرفت سے چھڑایا اور خود سے دور جاتی عائلہ کی طرف سرپٹ بھاگا اور اس کی چادر اٹھا کے اس کے گرد لپیٹی۔انگلی کی پوروں پہ اس کے زخم کا خون سمیٹتے،اس نے عائلہ کے نازک پیروں کے زخم دیکھے۔میر صاحب اُسے اتنی بے دردی سے گھسیٹ رہے تھے کہ عبداللہ کو لگا جیسے اس کا بازو کندھے سے جدا ہو جائے گا۔عائلہ کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا بالکل۔

اس سے پہلے کے عبداللہ اس سے بات کرتا گارڈز اس تک پہنچ چکے تھے۔اب عبداللہ دوبارہ اُن کی گرفت میں تھا۔

www.novelsclubb.com

شام رات کی چادر اوڑھ چکی تھی۔عبداللہ بھی اب گارڈز کے ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ خود سے دور جاتی زخموں سے چور چور عائلہ کو فکر سے دیکھتے ہوئے اس کی نظر ذاکرہ تک گئی۔کیا کچھ نہ کہا تھا اس نے اس ایک نظر میں،عائلہ کا خیال رکھنے کی تنبیہ،اس

کا ہم درد بننے کی التجا،اس کے زخموں پہ مرہم رکھنے کی استدعا، غرض اس ایک نظر میں اس نے عائلہ کو ذاکرہ کے حوالے کیا تھا اور ذاکرہ کی عام سی روتی آنکھوں نے بھی جیسے سب سمجھتے ہوئے یقین دہانی کرائی تھی۔

خود سے دور جاتی عائلہ کو اس نے آخری نظر دیکھا تھا۔عائلہ گاڑی تک پہنچ چکی تھی۔میر صاحب نے اسے کسی کپڑے کی گٹھڑی کی طرح اندر پھینکا اور زن سے گاڑی نکال لے گئے۔ان کے پیچھے گارڈز کی گاڑی جس میں باقی کے چار گارڈز موجود تھے، تیزی سے نکلی۔

عبداللہ کو احساس تھا کہ اب زندگی عائلہ کے لیے سنگ پاشی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔آج کے بعد اس ماہِ کامل کی ایک جھلک تو یک طرف وہ اس کی خوشبو کو بھی ترسے گا، پوری زندگی سمندر کی طرف بے دردی سے گھسٹتے عبداللہ کی آنکھوں سے گرم سیال بہا تھا۔خشک ہوتے ہونٹوں سے اس نے سرگوشی کی تھی۔

"الوداع عائلہ...الوداع۔"

☆...☆...☆

عائلہ کھانا کھا کے ڈائننگ روم سے نکل کے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ اس بڑے سے سفید تھیم کے ہال کے سفید چمکتے سنگِ مرمر کے فرش اور اوپر چھت سے لٹکتے دیو قامت کرسٹل کے فانوس نے اسے دو سال پہلے گزری قیامت کی یاد دلا دی۔

ڈھیروں مٹے مٹے سے منظر اس کے ذہن کے پردے پہ نقش ہونے لگے۔

ان لمحوں کا کرب اتنا شدید تھا کہ عائلہ اب بھی اپنے سر میں اٹھتی ٹیسیں محسوس کر رہی تھی۔

www.novelsclubb.com

یہی ہال تو اس کے درد کا گواہ تھا۔

جب اسے ٹھوکریں ماری گئیں، یہی سفید فرش تو تھا جس نے اسے سمیٹا تھا۔

جب اس کے منہ پہ طمانچے لگے خواہ وہ بابا کے ہاتھوں کے تھے یا ان کی زبان کے۔

اسی در و دیوار نے تو اسے سہارا دیا تھا۔

نظروں سے بے اعتباری کے ڈھیروں تیر برساتے اماں اور لالا کے بے نیاز چہروں کو، اسی فانوس نے تو عیاں کیا تھا۔

اُف !!!!

کیوں بابا کیوں؟

کیوں کیا آپ نے ایسے۔

ایک دفعہ مجھ سے صفائی تو مانگتے۔

www.novelsclubb.com

ایک دفعہ تو مجھے سنا ہوتا۔

کیوں بابا، کیا جاتا آپ کا اگر آپ ایک دفعہ سن لیتے کہ میں نے آپ کو دھوکا نہیں دیا تھا کہ میں آپ کی عائلہ ہوں میں سب کچھ ہو سکتی ہوں، پر بدکردار نہیں۔

بابا! ایک دفعہ صرف ایک دفعہ، آپ نے سنا ہوتا کہ میں اس سے محبت کرتی ضرور تھی، پر میں کبھی بغاوت نہ کرتی، میں مر کے بھی اس سے بات نہ کرتی، اس دن بھی وہ خود آیا تھا بابا، میں مانتی ہوں میری غلطی ہے، میں مانتی ہوں میں نے اس نا محرم کو خود کو چھونے دیا تھا۔

پر میں بھی انسان ہی تو ہوں بابا۔ میرا بھی عام لڑکیوں جیسا دل ہے۔ وہ لاکھ نا محرم سہی پر میرے دل کا محرم تو صرف وہ ہی ہے نا بابا۔

کیا سید زادیوں کے دل نہیں ہوتے بابا؟

یا ان کے دل گوشت پوست کے بجائے پتھر کے ہوتے ہیں؟

www.novelsclubb.com

بتائیں بابا۔

من ہی من بابا سے مخاطب، اس کی نظریں وحشت زدہ سی اس ہال میں گھوم رہی تھیں۔

وہ دو فروری کی شام جیسے لوٹ آئی تھی۔عائلہ کے نظروں کے سامنے اس شام کے منظر گھوم سے گئے۔

"بابا! میں نے کوئی دھوکا نہیں کیا۔"

زخموں سے چور، مٹی میں اٹا، یہ سسکتا وجود اس کا تھا جو لائونج کے بیچ و بیچ کسی مجرم کی طرح کھڑی تھی اور اس پہ کئی بے اعتبار آنکھیں گڑی تھیں۔

اس کی نظریں اس جگہ گئیں، جہاں بابا کے اس آخری زناٹے دار تھپڑ کے بعد وہ گر پڑی تھی۔

عائلہ کو اپنی بے بس نگاہیں یاد آئیں جو چہروں پہ اجنبیت سجائے اماں اور لالا کی طرف مدد کے لیے اٹھی تھیں۔اسے یاد تھا یہی وہ لمحہ تھا جب وہ مار سہتے سہتے ڈھے گئی تھی۔

WWW.NOVELSCLUBB.COM

کرب اتنا تھا کہ عائلہ آنکھیں میچ گئی۔اس دن کا درد عائلہ کی ساری زندگی پر چھا چکا تھا وہ کیسے اس دن کو بھلا سکتی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھ اپنے ہونٹوں پہ رکھتے ہوئے سسکیوں کا گلا گھونٹا۔پر آنکھوں سے رواں آنسو اس کے اختیار میں کہاں تھے۔وہ وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

اپنے ہی کرب پہ روتی ٹوٹی پھوٹی عائلہ،شاید اس پرانی عائلہ کو بھی رو رہی تھی جو اس شام اس جگہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی بلکہ شاید مر گئی تھی۔

کون تھی وہ اب۔

اس نے اجنبیت سے اپنے سونے ہاتھوں کو دیکھا۔بدرنگ کالے ماتمی لباس کو دیکھا ،سامنے دیوار پہ لگے شاندار آئینے میں زرد چہرے اور بکھرے بکھرے،کمزور نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔

میں عائلہ تو نہیں ہوں،اس نے اپنے خدوخال کو چھوا۔

کون ہوں میں پھر؟

اس نے سوچا۔ چمکتی بھوری آنکھیں جو مُسکراتی رہتی تھیں اب ویرانوں کا مسکن تھیں۔ رنگ اور خوشبو جیسی عائلہ کہاں تھی، سامنے عکس تو کسی بنجارن کا تھا۔

کیا ہوا گر ''وہ'' مجھے ایسے دیکھ لے؟

کیا وہ پھر بھی مجھ سے محبت کرے گا؟

محبت کا خیال ذہن میں آتے ہی وہ چونکی۔ خوف زدہ نگاہوں نے ارد گرد کسی ذی روح کی موجودگی کھوجی۔

کیا ہوا گر کوئی مجھے یہاں یوں سوگ مناتا دیکھ لے؟

www.novelsclubb.com

کیا ہوا گر بابا کو پتا چل جائے میں نے ابھی ابھی عبداللہ کو، اس کی محبت کو یاد کیا ہے؟

خوف کی ایک لہر اس کے رگ وپے میں سرایت کر گئی۔

قبائلی خاندانوں کے سخت اصولوں کا اندازہ کوئی اس بات سے کیوں نہیں لگاتا کہ خدا کے خوف کی بجائے اس سید زادی کے دل میں پہلا خوف، پہلا خیال اپنے بابا اور ان کی روایات کا آیا۔اس نے یہ نا سوچا کے اللہ جو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے، وہ کیا سوچیں گے۔اس کی ناراضی کا خیال آنے کے بجائے جو پہلا خیال اس کے ذہن میں آیا، وہ بابا کا تھا۔

اپنے بچپن سے اب تک جانے کتنی محبتوں کے گلے گھٹتے اس نے دیکھے تھے۔گدہ نشین ہونے کی وجہ سے اس کے بابا نے کئی محبتوں کو بہت عبرت ناک سزائیں دینے کے فیصلے نہایت اطمینان سے کیے تھے۔شاید یہی خوف تھا جو قائم تھا۔

عبداللہ اور عائلہ کی جان بخشی اتنا بڑا معجزہ تھا کہ وہ پھر لفظ ''محبت ''تک کو سوچ کے بھی، اپنی یا عبداللہ کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

بھوری سہمی نظریں، بابا کی آرام گاہ کے در کو چھو کے لوٹیں۔

اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھے، دوپٹا درست کرتی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

کمرے کا دروا کیے وہ حیران چوکھٹ پہ کھڑی تھی۔ یہ کمرے کا دروازہ ہی کھلا تھا یا بھولی بسری عبداللہ کی یادوں کے لیے اپنے دل کے بند کواڑ کھولے تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

ان دو سالوں میں کسی نے اس کے کمرے کی کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہلایا تک نہیں تھا۔

پلنگ پہ سیاہ سلوٹ زدہ چادر، سرہانے ادھ کھلی کتاب، باغیچے کے سمت کھلنے والا دیو قامت دریچہ، پائنتی کے پاس بچھی سیاہ جائے نماز، اس کا مڑا ہوا کونہ، جو دو سال پہلے اس روز نماز عصر ادا کر کے وہ موڑ گئی تھی۔

سسکتی عائلہ کی آنکھوں سے آنسو، موسلا دھار بارش کی طرح برس کر جل تھل مچا رہے تھے۔

اس کے چوکھٹ پہ ٹکے قدم اندر کی جانب بڑھے۔ کمرا عبداللہ کی یادوں سے مہک رہا تھا۔

اُف خدایا کہیں میں نے واپس آکر غلطی نہ کر دی ہو؟

اس نے بے ساختہ سوچا۔

#عشق_لا

www.novelsclubb.com

فریال سیّد ✍

قسط نمبر 3۔

عبداللہ کی محبت کمرے کی ہر چیز سے ٹپک رہی تھی۔عائلہ اپنی جائے نماز کے قریب جا بیٹھی۔سجدے کی جگہ اس نے انگلیاں پھیریں۔دو سال پہلے اس شام کیفے جانے سے پہلے، عصر کے بعد سجدے میں گڑگڑا کے،اس نے عبداللہ کی محبت ہی تو مانگی تھی۔

جائے نماز کا مڑا ہوا کونا سیدھا کرتے اس کی انگلیاں تسبیح سے مس ہوئیں۔یہ وہی کالے عقیق کی تسبیح تھی جو بابا بطور خاص اس کے لیے تحفتاً ایران سے لائے تھے۔ اس تسبیح پر بھی صبح و شام عائلہ نے عبداللہ کا نام ہی تو جپھا تھا۔

اگر بابا کو یہ بھی پتا چل جائے تو؟

شرم ساری کا غلبہ اب بھی تھا۔

www.novelsclubb.com

عائلہ نے روئی روئی نظریں چرا کے پلنگ کی طرف دیکھا جس کے سرہانے اب بھی ایک کتاب ادھ کھلی رکھی تھی۔

''عبداللہ۔''

ہاشم ندیم خان کی ''عبداللہ'' ہاتھ میں پکڑے ہونٹوں نے سرگوشی کی تھی۔

اگلے پل اس نے ایسے کتاب کو ٹٹولا، جیسے اچانک کچھ یاد آیا ہو۔

اسی اثنا میں سلیقے سے طے شدہ کاغذ اس کے قدموں میں آ گرا۔اس نے عجلت میں جھکتے ہوئے کاغذ اٹھا کے اس پر سے گرد جھاڑی۔

سہولت سے اسے کھولتے ہوئے،اس کی نگاہیں سطروں پہ دوڑ گئیں۔اوّلین محبت کے ان چھوئے جذبات کو بے وزن لفظوں میں ڈھالے،اس نے خود ہی صفحۂ قرطاس پہ نقش کیا تھا۔

www.novelsclubb.com

بیتے سالوں نے لکھنے والی کو بدل ضرور ڈالا تھا، مگر اس کے دل میں چھپے بیش بہا قیمتی اور پاکیزہ جذبات کہاں بدلے تھے۔ آنسوئوں کی دھند کے پار وہ اپنی تحریر پڑھ رہی تھی:

تو سورج میرا میری جان عبداللہ

میرا تن من جائے تجھ پہ قربان عبداللہ

تجھے دیکھ جیوں، تجھے دیکھ مروں

تجھ میں ہی اٹکی میری جان عبداللہ

تو ہی خوشی ہے، تو ہی سکوں میرا

www.novelsclubb.com

میں تجھ پہ جاں صدقے واری عبداللہ

جو مُسکرا دے تو، مجھے دیکھ کے یوں

تو کیوں نہ تم پہ میں مر جائوں عبداللہ

تو ہی سورج چاند، تو ہی تارا میرا

تو کیوں نہ لے آسمان بلائیں تیری عبداللہ

میری آنکھیں، باتیں، خواب ہو تم

تم ہی میری ہر ایک سانس عبداللہ

کہو تو رکھ دوں قدموں میں دل اپنا

پھر اس کو روند کے امر کر دو عبداللہ

میں پری ہوں کوہ قاف کی

تو شہزادہ پربتوں کا عبداللہ

www.novelsclubb.com

میں تو تیری ہوئی ازلوں سے

ہے تیری کس میں جان عبداللہ؟

"مجھ میں...؟"

"مجھ میں ہے اس کی جان..."

کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔اس پہ وحشت سی طاری تھی۔

اس کی جان مجھ میں ہے۔

پر...

پر میں نے خود ہی تو اس کی زندگی کے بدلے اپنی محبت کا سودا کیا تھا۔

وہ ہذیانی انداز میں خود سے باتیں کر رہی تھی۔ کبھی خود کو یقین دلاتی تو کبھی خود سے پوچھتی۔

www.novelsclubb.com

کیوں کیا میں نے ایسا؟

اپنی محبت کا مقبرہ بنا کے دفنا دیا کیوں؟

اس کی نظروں کے سامنے دو سال پہلے کے کچھ منظر گھوم گئے۔عائلہ نے اپنے ہونٹ بھینچے تھے۔

کم زوری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

ہشاش بشاش نظر آتی ڈاکٹر نے نہایت ہلکے پھلکے انداز میں اس سے کچھ سوال کیے تھے۔

خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے عائلہ نے نقاہت زدہ آواز میں دو تین مختصر جواب دیے تھے۔

"بہت اچھے عائلہ ! آپ تو بہت جلدی صحت یاب ہو گئیں۔"لبوں پہ پیشہ ورانہ مُسکراہٹ سجاے وہ عائلہ کے بے تاثر چہرے کو غور سے جانچتی رہیں۔

پھر خود ہی "brave girl" کہتیں،اس کا گال تھپتھپا کے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اور عائلہ پھر سے نظریں چھت پہ جمائے،اپنے سوچوں کے بحر میں غوطہ زن ہو گئی۔بہت سے بے ربط خیال تھے جو اس کے ذہن میں نوحہ کناں تھے۔

"یہ ڈاکٹر کیوں کہہ رہی تھی کہ میں جلد صحت یاب ہوئی ہوں۔مجھے تو جانے کتنے دن گزر گئے یہاں یوں پڑے پڑے۔"

"مجھے گھر نہیں جانا واپس۔میں کیا کروں گی واپس جا کر۔عبداللہ جانے کیسا ہو گا اب؟کس سے پوچھوں خدایا!"

دو آنسو آنکھوں کے کونوں سے بہ کے بالوں میں جذب ہوئے تھے۔

ہوش میں آنے کے دو دن بعد تک مسلسل اماں اور لالا اسپتال آتے رہے۔وہ آتے عائلہ سے بات کرنے کی کوشش کرتے،اسے کچھ کھلانے کی کوشش کرتے،پر عائلہ ان سے منہ موڑے چپ چاپ بستر پہ لیٹی رہتی۔

انہیں اندازہ تھا کہ عائلہ ناراض ہے پر جب اس نے ایک دن اماں کے ساتھ آئی ذاکرہ سے کہا:

''آئندہ صرف تم ہی آنا کافی ہے۔''

تب لالا اور اماں کو اس کی ناراضی کی انتہا پتا چلی۔

اماں نے اس کی خواہش کے مطابق آنا چھوڑ دیا پر لالا اکثر آتے، باہر ہی سے ڈاکٹروں سے بات کر کے چلے جاتے۔جب کہ ذاکرہ روز آتی۔

عائلہ اس سے بھی منہ موڑ کے لیٹی رہتی اس لیے نہیں کہ وہ ناراض تھی، بلکہ ایک سید زادی ہو کر محبت کرنے کی شرمساری چھپانے کو۔ وہ اکثر سوچتی مجھ سے تو ذاکرہ اچھی ہے اس کے دامن پر کوئی داغ تو نہیں۔یہی کمتری کا احساس اسے نظریں چرانے پہ مجبور کرتا۔

اچانک دستک کی آواز پہ عائلہ چونکی۔اس کے بے ربط خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا۔

اگلا بندہ دستک کے بعد تھوڑی دیر رکا اور پھر خود ہی اندر داخل ہو گیا۔

قدموں کی دھمک بتا رہی تھی کہ آنے والا اس کا لالا معید سید ہی ہے۔

عائلہ بازو آنکھوں پہ رکھے، سوتی بن گئی۔

"عائلہ!"

لالا کی آواز گونجی۔

وہ سوتی بنی رہی۔

"گودی! مجھے پتا ہے تم جاگ رہی ہو۔" وہ مزید بولا۔

عائلہ نے بازو ہٹا کے دیوار پہ نظر جمائی کہ لالا اسے پہچانتے تھے، ان کے سامنے یہ سب کرنا بے کار تھا۔

"بابا نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ تم گھر آئو یا بابا سے تمہارا سامنا ہو۔ ان کا فیصلہ ہے کہ تم واپس کرانی چلی جائو۔"

ٹوٹے ہوئے لہجے میں لالا نے اسے بابا کا فیصلہ سنایا۔

"بہت مشکل سے میں نے انہیں راضی کیا ہے کہ تم شانزے کے ساتھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لو اور اپنی ڈگری مکمل کر لو۔"

وہ مزید بولے۔

"اور روانگی آج ہی ہے۔ تمہارا سامان گاڑی میں رکھا ہوا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد تمہاری فلائٹ ہے۔"

وہ خاموش ہوئے تو اتنے عرصے میں پہلی دفعہ عائلہ کچھ بولی۔

"بدلے میں، میں بھی کچھ چاہتی ہوں۔"

www.novelsclubb.com

بہن کے سپاٹ بے رنگ چہرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا معید ابراہیم سید بولا:

"بولو؟"

"مجھے عبداللہ کی زندگی، اس کی خیریت کی ضمانت چاہیے۔ بس!"

اب کہ عائلہ نے لالا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا تھا۔

آج معید نے زندگی میں پہلی دفعہ اپنی بہن کی آنکھوں میں بغاوت دیکھی تھی ۔ تبھی میکان کی انداز میں بولا:

"ٹھیک ہے میں ضمانت دیتا ہوں تمہیں۔ کوئی اسے کچھ نہیں کرے گا، پر بدلے میں تم کبھی اس کا نام اپنے ہونٹوں تک بھی نہ لائو گی۔"

عائلہ کی آنکھیں چمکی تھیں۔

"منظور ہے۔"

اس نے اپنی محبت کی قبر پہ مٹی کا آخری بیلچہ ڈالا تھا۔

www.novelsclubb.com

گاڑی میں بیٹھے ائیر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے، اس نے ڈھلتے سورج کو سرگوشی کرتے سنا تھا۔

"الوداع اے پیاری لڑکی الوداع۔"

اسے لگا جیسے عبداللہ کے شہر کے کئی منظر اسے الوداع کہتے، رو پڑے تھے۔

"عائلہ کا سفر۔"

کوئٹہ ائیر پورٹ سے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اتنے خوب صورت مناظر نظروں سے ہو کے گزرے کے عائلہ حیران رہ گئی۔ کیا یہ وہی کوئٹہ ہے جہاں اس نے اپنا سارا بچپن گزارا تھا؟

کیا تب بھی کوئٹہ اتنا حسین ہوتا تھا؟

کیا تب بھی شام ڈھلے جب سورج کی شعاعیں مہرِ در کی چوٹی پہ پڑتی تھیں، اس پہ جمی برف ہیروں کی طرح چمکتی تھی؟ کیا تب بھی اوائل فروری کے دنوں میں کوئٹہ یونہی دھند، بوندا باندی اور کبھی کبھی برف باری میں لپٹے، آنے والی بہار کی خوشبو بسائے، کسی الف لیلیٰ کی کہانی جیسا اسرار خود میں سموئے رکھتا تھا؟

کیاتب بھی اندھیرا چھانے کے بعد مغربی بائی پاس سے گزرتے ہوئے، نیچے نظر آتی شہر کی روشنیاں اتنا حسین چراغاں کیے رکھتی تھیں؟

عائلہ نے اتنے دلکش منظر کہیں نہیں دیکھے تھے۔

مغربی بائی پاس کوئٹہ شہر کے مقابلے اتنی اونچائی پہ تھا کہ مغربی سے لے کر مشرقی بائی پاس تک شہر کا کونا کونا دکھتا تھا۔

اندھیرا چھاتے ہی جب ڈھیروں روشنیاں ایک ساتھ ٹمٹماتیں، تو ایسا لگتا کہ آسمان اور اس پہ چمکتے تارے ماند پڑنے لگے ہوں۔ یہ منظر اتنا حسین لگتا کہ دنیا کا کوئی بھی منظر اس کے سامنے ماند پڑ جائے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا آسمان زمین پہ ہو اور ٹمٹماتی روشنیاں تارے ہوں۔

www.novelsclubb.com

اپنی سوچوں میں گم، عائلہ حیران تھی کہ اتنے عرصے یہ خوب صورتی اس کی آنکھوں سے مخفی کیسے رہ گئی؟

یہ سارے منظر کتنے عام سے لگتے تھے۔

پر اب...

اب کیا بدلا تھا؟

"میری نظر۔"

"ہاں! میری نظر ہی تو بدلی ہے۔اب میں آنکھوں سے کہاں دیکھتی ہوں؟"

"اب تو میں محبت سے دیکھتی ہوں۔" اس کی پلکیں نم ہوئی تھیں۔

اب اونچائی سے اس کے گائوں کی روشنیاں بھی دکھ سکتی تھیں۔

خواجہ ولی بابا کے مزار کا سنہرا گنبد ڈھیروں روشنیوں کے ہالے میں، روزِ روشن کی طرح چمک رہا تھا۔

www.novelsclubb.com

گاڑی بائے پاس سے اتر کر اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے ہوتی، خواجہ بابا کے مزار کے پاس سے گزری۔

عائلہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

خاموش لب اور نم آنکھوں سے اپنی ہتھیلیوں کو تکتے وہ حیران تھی کہ کیا مانگے۔

اسے یاد تھا بچپن میں اسکول سے آتے جاتے وہ دعا مانگا کرتی۔ گاڑی خواجہ کے مزار کی وسیع و عریض حدود سے دور نکل جاتی، پر تیزی سے دعا مانگتی عائلہ کے لب نہ رکتے اور آج اسی عائلہ کے لب خاموش تھے۔

وہ مانگے بھی تو کیا مانگے؟

''عبداللہ...''

اس کے ہونٹوں کی جنبش پہ دو آنسو پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پہ آ گرے، مگر یہ حق بھی تو وہ کھو چکی تھی۔ کیسے مانگے عبداللہ کو؟

www.novelsclubb.com

آنسو رواں تھے اور اب لبوں پہ دعا بھی...

"یا اللہ پاک! مجھے صبر دے، میرے مولا تکلیف بہت ہے اور میرا صبر کم تر، میرا صبر وسیع کر دے۔ مجھے میرے فیصلے پہ قائم رکھ کہ پھر میں اس کا نام بھی ہونٹوں پہ نہ لائوں۔ مجھ سے اس کی مزید تکلیف نہ دیکھی جائے گی میرے رحمن مولا۔ مجھے میری زبان پہ قائم رہنے کا حوصلہ دے۔"

"آمین۔"

اس نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرے ہی تھے کہ گاڑی حویلی کی طرف جانے والے رستے پہ گامزن ہو چکی تھی۔ قطار سے لگے پائن کے درخت، بابا کا ڈیرا، شاندار بیٹھک، سب ویسے کا ویسا ہی تو تھا۔ یہ بیتا وقت کلی کرانی پر جیسے گزرا ہی نہیں۔ اگلے پل ایک ہلکے سے جھٹکے سے گاڑی رکی۔ عائلہ کی نظریں اٹھیں اور اپنی حویلی پہ گڑھ کے رہ گئیں "آہ! شاہ ہائوس۔"

سب کچھ ویسے کا ویسا ہے، پر تم اجڑے اجڑے کیوں دکھتے ہو؟

www.novelsclubb.com

کیا تم پر بھی کوئی قیامت بیتی ہے؟"

خاموشی کی زبان میں سوال کرتی عائلہ اور سنتی وہ بنجر حویلی، جیسے ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔

ہاں! بے شک...

ایک بنجر کو آباد ایک بنجارن ہی کر سکتی ہے۔

"اڑی بو خیرٹ کنا گودی ای خیرات نے کے۔" ارے! آئیں خیر سے میری گودی، میں صدقے آپ پہ۔

ماہ پری شاید دہلیز پر کھڑی، اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ تبھی اس کی ایک جھلک دیکھتے ہی لپک کے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے اس پر، اپنی دونوں آنکھیں رکھیں اور پھر ہونٹ رکھ کے اسے تعظیم بخشا۔

ماہ پری ذاکرہ کی ماں تھی۔ بچپن سے ان پر جان چھڑکتی تھی۔اس کا پورا خاندان ان کی خدمت اپنا فرض سمجھ کے کرتا۔شاید انہیں ماں کی کوکھ ہی سے سادات کی خدمت کا سبق دیا جاتا تھا۔

عائلہ نے بچپن سے ماہ پری اس کے خاندان اور بابا کی ڈھیروں مرید عورتوں کو خود سے ایسے ہی ملتے دیکھا تھا۔وہ ہمیشہ ایسے ملتیں جیسے سید زادیوں کو زیارت کر رہی ہوں۔

اسے کبھی کبھی بہت عجیب بھی لگتا کہ ہم بھی ان ہی کی طرح انسان ہی تو ہیں۔ تبھی اکثر ملنا ترک کر کے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

عائلہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی جب یخ بستہ ہوا کے جھونکے نے اسے خیالوں کی دنیا سے حقیقت میں لا پٹخا۔

عائلہ سید نے خود کو حیرت سے تکتی ماہ پری کو رسمی مُسکراہٹ، چہرے پہ سجاتے جواب دیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتی حویلی کے اندر قدم دھرے۔

ہر سو اُداسی، خاموشی، یاسیت۔ایسا تو نا تھا شاہ ہائوس جب عائلہ اسے چھوڑ کے گئی تھی۔

سفید سنگِ مرمر کی روش بارش کے بعد دھلی دھلی سی لگ رہی تھی۔ان کا بڑا سا عالی شان باغیچہ ابھی تک خزاں کے زیرِ اثر تھا۔کیاریوں میں جہاں کبھی ہر قسم اور ہر رنگ کے گلاب مہکتے تھے، جھاڑ جھنکار اُگ آئی تھی۔

سامنے کھڑی سفید حویلی اپنے اندر جانے کتنے راز چھپائے، پراسراریت سے کھڑی تھی۔

www.novelsclubb.com

ماہ پری اور اس کے ساتھ دو تین لڑکیاں بھاگم بھاگ اس کا سامان کمرے میں سیٹ کر رہی تھیں۔

عائلہ یونہی چلتے چلتے حویلی کے پچھلے صحن کی طرف آگئی۔سامنے ہی اسے اخروٹ کا وہ درخت نظر آگیا جس میں جھولا جھولتے اس کا سارا بچپن گزرا تھا۔چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی عائلہ درخت تک آئی۔

اس کی شاخوں پر خزاں رقصاں تھی۔عائلہ نے پیار سے اس کے تنے پہ انگلیاں پھیریں۔بیتے وقت نے درخت کو مزید قد آور بنادیا تھا،البتہ جو ویرانی اب اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی پہلے کبھی اس کا مقدر نہ تھی۔عائلہ کا بچپن اسی کے سائے تلے کھیلتے گزرا تھا۔یہ درخت اس کے دکھ سکھ کا ساتھی تھا۔عائلہ کو اندازہ تھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد یہ کتنا اکیلا ہو گیا ہو گا۔

اس نے نظر اٹھا کے درخت کی تاحدِ نگاہ پھیلی شاخوں کو دیکھا۔اچانک اسے خود پہ کسی کی نظروں کا ارتکاز محسوس ہوا۔عائلہ نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔کسی کا وجود اپنے گرد نہ پا کے،اس نے حویلی کے پچھلی طرف کھلنے والے دریچوں پہ نگاہ کی۔وہ ایک کمرا جس کا نہ اس نے کبھی دروازہ کھلا دیکھا تھا،نہ ہی اس کے واحد

دریچے سے پردے ہٹے دیکھے تھے۔اس کمرے کے مکین کی نظروں کاارتکاز تھاجو اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔پردہ ہٹائے وہ جانے کتنی دیر سے عائلہ پہ نظر کیے ہوئے تھیں۔عائلہ تھوڑی دیر حیرانگی سے دریچے کے پار نظر آتے ہیولے کو دیکھتی رہی پھر خوشگوار حیرت سے دریچے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ وہ پردے برابر کرتیں تیزی سے پرے ہٹ گئیں۔

ششدر کھڑی عائلہ کے ہونٹوں نے سرگوشی کی تھی:

''اماں کاکی۔''

اماں تو ماں کو ہی کہتے ہیں جب کہ ''کاکی ''فارسی میں بہن کو کہتے ہیں۔

بچپن میں معید کی تربیت اس کی واحد پھپھو نے کی تھی۔تبھی وہ سکینہ صاحبہ کے ساتھ ساتھ،اپنی پھپو آبگینے کو بھی اماں کہتا تھا۔معید کی تقلید میں عائلہ بھی آبگینے

سید کو اماں کہتی تھی، پھر بابا کو انہیں "کاکی" بلاتے دیکھ، اماں کاکی بلانے لگی۔ آہستہ آہستہ معید، شانزے، علیزے اور شاہ زین بھی انہیں اماں کاکی بلانے لگے۔

علیزے، شانزے اور شاہ زین ان کے چچا کے بچے تھے۔ جب تک دادا دادی حیات تھے، سب ایک ساتھ اسی حویلی میں رہتے تھے۔ پھر ان کے جانے اور بچوں کے بڑے ہو جانے کے بعد چچا افراہیم سید، باہمی رضامندی سے باغ والی حویلی میں منتقل ہو گئے۔

سید قبیلے میں "کزنز" کا بھی کوئی تصور نہیں۔ بچے بڑے ہو جائیں تو ان پر ایک دوسرے سے پردہ کرنا لازم قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ان کے منتقل ہونے کی ایک اہم وجہ تھی۔ البتہ آبگینے سید اپنی مرضی سے بڑے بھائی کے پاس رہتی تھیں۔ ان کی تعلیم جاری تھی۔ ابھی وہ میٹرک میں تھیں کہ ایک دن جانے کیوں وہ گھر آئیں تو، رنگ فق اور آنکھیں لال تھیں۔ آتے ہی اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ پھر کچھ دن بعد میر ابراہیم سید اور سکینہ صاحبہ کی ان سے دیر تک تکرار

ہوئی۔ جانے کیا ہوا کیسے ہوا، لیکن کچھ دن بعد، سب کو بتادیا گیا کہ آبگینے سید نے اپنی مرضی سے تعلیم اور دنیا کو ترک کر کے ''فقر'' کو اپنالیا ہے۔

بلوچستان میں اسے ''ستی'' کہتے ہیں۔ اکثر قبائل میں زبردستی بھی بہنوں بیٹیوں کو ستی بنادیا جاتا تھا۔ کچھ اپنی مرضی سے دنیاوی زندگی اور ہر خوشی رنگ و بو کے در خود پہ بند کر کے ایک کمرے میں قید ہو کے یادِ الٰہی کو اپنالیتی تھیں۔

آبگینے بہت زندہ دل لڑکی تھی۔ اس کا رشتہ بچپن ہی میں اس کے ماموں کے بیٹے سے طے تھا۔ ابھی میٹرک کے بعد اس کی شادی ہونی تھی، لیکن اس نے تو میٹرک بھی مکمل نہیں کیا اور یوں ایک کمرے میں مقفل ہونے کا ارادہ کر لیا۔ تبھی یہ خبر پورے خاندان کو چونکا گئی۔

www.novelsclubb.com

بہر حال پورے خاندان کو دعوت دی گئی۔ پر تکلف کھانے کے بعد، سفید لباس میں ملبوس آبگینے کو لایا گیا۔ تمام خواتین باری باری، اسے پھولوں کے ہار پہناتی مبارک باد دیتیں، ماتھا چومتیں۔ گلابی چہرہ لیے نظریں جھکائے بیٹھی آبگینے کو دیکھ

اس کی ممانی جان کی آنکھیں چھلک آئیں۔آخر دل کے ہاتھوں مجبور اسے گلے سے لگائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں۔اسے بہو بنانے کا ان کا ارمان جو ٹوٹ گیا تھا۔

اسے خود سے لگائے ہی اس کے کان میں سرگوشی کی:

"آبی! کسی نے تمہیں مجبور تو نہیں کیا نا؟"

اس سے پہلے کی سسکتی آبگینے کچھ بولتی۔سکینہ سید ہاتھ میں قرآن پاک پکڑے تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔

"اُٹھ جا آبی! رخصتی کا وقت آن پہنچا ہے۔"

دونوں بھائی آگے بڑھے اور اسے قرآن پاک کے سائے تلے، کسی دلہن کی طرح، پورے قبیلے کے سامنے، اس کے کمرے میں تنہائی کی عمر قید کاٹنے کے لیے اکیلا چھوڑ گئے۔ سسکتی آبگینے نے ایک محتاط نظر اٹھا کے ممانی کو دیکھا تھا۔

اپنے آنسو پونچھتی اس کی ممانی چونکی تھیں۔کچھ تو تھا آبی کی نظروں میں مگر کیا؟

اِس سے پہلے کے ممانی یہ پہیلی سلجھا پاتیں، آبگینے اپنے قید خانے میں قدم رکھ چکی تھی۔

"عائلہ! عائلہ... کدھر ہو؟ عاعاعایل یل یل آآآ۔"

یہ کھنکتی ہوئی آواز شانزے کے علاوہ اور کس کی ہو سکتی تھی؟ بے صبری سے حویلی کے صحن میں داخل ہوتے ہی عائلہ کو آوازیں دیتی، وہ اندر کی طرف ہی آ رہی تھی۔

عائلہ سید جو اپنے کمرے میں مسہری پہ براجمان، پروین شاکر کی "ماہِ تمام" کھولے اس میں گم تھی۔ کتاب بند کرتے ہوئے کمرے کے ادھ کھلے دروازے پر اپنی منتظر نگاہیں ٹکاتے ہوئے، شانزے کا انتظار کرنے لگی۔

لمبے چوڑے، دالان سے گزرتے شانزے سید کے چہرے پہ، دریچوں کی رنگین کانچ سے منعکس ہوتی دھوپ، رنگین لکیریں کھینچ رہی تھی۔ پر وہ تو شانزے تھی۔ا

س کے چہرے پہ ویسے ہی قوسِ قزح کے رنگ بکھرے رہتے یہ مصنوعی رنگ ا س پر کیا چڑھنے تھے۔

محبت بھی عجب رنگین مزاج احساس ہے جس پر مہربان ہو جائے،اس کے چہرے پر دھنک بکھیر دیتی ہے۔پھر نہ تو ہونٹوں سے مُسکراہٹ ہٹتی ہے اور نہ ہی باتوں سے خوش اخلاقی جاتی ہے۔

دن جاگتی آنکھوں میں خواب سجاتے گزرتے ہیں اور رات بند آنکھوں میں سپنے پروتے۔

کچھ لوگ مر بھی جائیں تب بھی محبت ان پہ مہربان نہیں ہوتی اور کچھ لوگوں کی ایسی قسمت ہوتی ہے کہ جس کے خواب آنکھوں میں سجاتے ہیں وہی بن مانگے ان کی تقدیر بنا دیا جاتا ہے۔شانزے بھی ان ہی خوش قسمت لوگوں میں تھی۔بچپن سے جس معید کے سپنے اس کی پلکوں پہ سجے تھے۔خدا نے بنا کسی تگ و دو کے اسی معید کو اس کا مقدر بنا دیا۔

اور پھر جب اسے علم ہوا کہ معید نے ہر ممکن کوشش کر کے بابا اور شانزے کے ابا کو شانزے کی اعلیٰ تعلیم کے لیے راضی کیا ہے۔ شانزے ہوائوں میں اڑنے لگی۔ا سے لگا معید کے دل میں بھی کہیں اس کی محبت رہتی ہے۔ یہ منگنی کے بعد کا وہ سنہری دور تھا۔ جب پیر زمین کی جگہ بادلوں پہ ہوتے ہیں اور آنکھوں میں سپنوں کی چمک صاف دیکھی جاسکتی ہے۔

شانزے کے حسین چہرے پہ حسرت سے نظریں ٹکائے عائلہ تب چونکی جب شانزے نے چٹکی بجائی۔

"کدھر گم ہو بھئی؟ میں کب سے بک بک کر رہی ہوں، مجال ہے جو محترمہ کوئی جواب ہی دے دیں۔"

www.novelsclubb.com

کالی بڑی بڑی آنکھوں میں مصنوعی خفگی سجی تھی۔

"ارے نہیں! میں تو بس...ایسے ہی کچھ سوچ رہی تھی۔دوبارہ بتانا کیا کہہ رہی تھیں۔"

عائلہ نے شرمندہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"میں کہہ رہی تھی کہ یونیورسٹی چلو گی؟مجھے کچھ کام ہے،تم بھی چلو۔داخلے کا کچھ کرتے ہیں۔"

اب کے شانزے سنجیدگی سے بولی۔

"ہاں کیوں نہیں چلو چلیں۔"عائلہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔تب ہی شانزے کی نظر اس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب پر گئی۔عائلہ!ایک بات پوچھوں؟"

www.novelsclubb.com

شانزے کے فکرمند لہجے نے عائلہ کے دماغ میں احتیاط کی گھنٹی بجائی تھی۔

"ہاں پوچھو۔"زبردستی مُسکراتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"سب ٹھیک ہے نا عائلہ ؟ مجھے نہ تم ٹھیک لگ رہی ہو نہ یہ سب۔ تم تو کبھی اکیلے اس حویلی میں یوں نہ رہتی، نہ ہی تمہاری طبیعت ٹھیک لگ رہی ہے مجھے، جب سے آئی ہو اس کمرے میں بیٹھی ہو۔ نہ نکلتی ہو نہ ہنستی ہو، نہ پہلے کی طرح باتیں کرتی ہو ، کھانا بھی ماہ پری نے بتایا برائے نام کھاتی ہو، بس تم ہو اور یہ کتابیں ہیں، یہ کمرا ہے ۔ کیوں ؟ کیا ہوا ہے ؟ تم مجھے تو بتا سکتی ہو۔"

عائلہ نے نظریں جھکا کے تمام تر کوشش سے آنسو پیے تھے۔ پھر اس کی طرف دیکھ کے مصنوعی سا مُسکرائی تو آنکھیں چمکی تھیں۔

"نہیں تو ایسا تو کچھ بھی نہیں، تم فضول میں فکر کر رہی ہو۔ اصل میں میری ہی ضد تھی یہاں تمہارے ساتھ آ کے پڑھنے کی تبھی بابا کو مجبور ہو کے مجھے بھیجنا پڑا۔ آپس کی بات یہ ہے کہ اصل میں معید لالا چاہتے تھے کہ میں ان کی دلہن کے ساتھ رہوں تاکہ وہ نالائق جلدی سے پڑھ لکھ جائے اور لالا کی شادی ہو جائے۔"

لہجے میں زبردستی شرارت کی رمق بھرتے عائلہ نے بات مکمل کی۔

کچھ مطمئن نظر آتی شانزے نے اس کے تاثرات جانچتے ہوئے پھر سے پوچھا۔

"سچ کہہ رہی ہو نا عائلہ ؟"

"بالکل سچ !" عائلہ نے یقین دہانی کرائی۔

"اچھا چلو باہر چلتے ہیں، پچھلے صحن میں جھولا جھولیں؟"

عائلہ نے بات بدلنے کو کہا اور اس میں کامیاب بھی رہی۔ اگلے پل ماہ پری کو چائے کا کہتی وہ شانزے کو ساتھ لیے پچھلے صحن کی طرف بڑھ گئی۔

جھولے پہ بیٹھی شانزے اور اخروٹ کے درخت سے ٹیک لگا کے کھڑی عائلہ، ہاتھوں میں چائے کے کپ تھامے، کسی پرانی شرارت کو یاد کر کے کھلکھلا رہیں تھیں۔

www.novelsclubb.com

فروری کی ٹھنڈی دھوپ شام کا لبادہ اوڑھ رہی تھی۔ جب اُنہیں لگا کسی نے اُنہیں آواز دی ہو۔

اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دونوں نے تسلی کی کہ کوئی نہیں اور پھر سے خوش گپیوں میں مشغول ہو گئیں۔

"ہِش ہِششش..." دونوں چونکیں۔ کوئی انہیں متوجہ کر رہا تھا۔

محتاط نظروں سے اپنے گرد دیکھتی عائلہ کی نظر، حویلی کے دریچوں پہ گئی۔

دریچے میں کھڑا ہیولا بلاشبہ آبگینے سید کا تھا جو انہیں اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتی تھیں۔

عائلہ اور شانزے نے تھوڑی دیر بے یقینی سے انہیں دیکھا، پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کرتیں، دریچے کی جانب بڑھ گئیں۔

ابھی دونوں دریچے کے قریب پہنچی ہی تھیں کہ آبگینے سید ہذیانی انداز میں ہنسنے لگیں۔ شانزے نے خوف زدہ نگاہوں سے عائلہ کو دیکھا۔ عائلہ نے ہمت کرتے ہوئے دھیرے سے اُنہیں پکارا:

"اماں کاکی!"

وہ ہنستے ہنستے چونکیں، نظریں نیچے زمیں پہ مرکوز تھیں۔چہرے پہ گزرا وقت دگنا ہو کے سلوٹیں چھوڑ گیا تھا۔تیکھے حسین نقش وحشت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

خوبصورت کالے بال جو کمر تک آتے تھے،روکھے اور بے جان سے چہرے پہ بکھرے ہوئے تھے۔ان میں چاندی کی آمیزش اُنہیں مزید پراسرار بنا رہی تھی۔

اندر کی طرف دھنسی حلقوں میں لپٹی کالی آنکھیں،جو کبھی بے حد حسین ہوتی تھیں ،اٹھیں تو ان میں وحشت کا پورا جہاں آباد تھا۔ان کی انگاروں جیسی لال آنکھیں عائلہ پہ ٹک گئیں۔عائلہ کو اپنا سارا وجود جھلستا ہوا محسوس ہوا۔

شانزے کبھی آبگینے کو تو کبھی عائلہ کو دیکھتی۔

آبگینے عائلہ کو دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کچھ بڑبڑانے لگیں۔شانزے اور عائلہ دریچے کے تھوڑا مزید قریب ہوئیں تاکہ ان کی سرگوشی سمجھ سکیں۔پر ہر کوشش

ناکام رہی کہ آہستہ آہستہ آبگینے سید کی بڑبڑاہٹ سرگوشی سے آواز میں ڈھلنے لگی۔ ان کی نظریں اب بھی عائلہ پہ ٹکی تھیں۔

"تم باغی ہو... تم بھی باغی ہو۔ بغاوت تمہارا بھی نصیب ہے۔"

الفاظ تھے کہ زلزلہ؟

عائلہ پھٹی پھٹی آنکھوں اور زرد چہرے سے ان کی طرف دیکھتی دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

عائلہ کو یوں ڈرتا دیکھ وہ دوبارہ سے ہذیانی قہقہے لگانے لگیں۔ اچانک ہنستے ہنستے رکیں۔ اب کے بولیں تو لہجہ اتنا ٹوٹا ہوا تھا کہ اس کا کرب عائلہ اور شانزے اپنے دل میں محسوس کر سکتی تھیں۔

www.novelsclubb.com

"ذات نہ دیکھ جھلیے ذات کی کیا اوقات؟ عشق دیکھ، دل دیکھ، روح دیکھ۔ روایات کی زنجیر توڑ عشق کر، عشق کر، بس عشق کر۔ باقی سب چھوڑ، باقی سب مٹی۔

صرف اپنی چاہ دیکھ۔ عشق کو "چاہ" بنا، "لا" نہ بنا مجھ جیسی ہو جائے گی۔ باقی سب چھوڑ، عشق کر عشق، عشق کر عشق، عشق کر عشق۔"

اب وہ رو رہی تھیں۔ سسکتے ہوئے دہرا رہی تھیں۔ "عشق کر عشق۔"

سسکیاں آہوں میں بدلیں اور آہیں جانے کب چیخوں میں۔

وہ چیختی ہوئیں دھاڑیں مار مار کے رو رہی تھیں اور بار بار عائلہ کی طرف دیکھ کے کہتیں۔

"عشق کر عشق۔" دریچے پہ سر پٹختیں اور پھر عائلہ کی طرف دیکھ کے کہتیں:

"عشق کر عشق۔"

www.novelsclubb.com

عائلہ کو اپنے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑتے محسوس ہوئے۔ ہکا بکا کھڑی شانزے ششدر تھی کہ کیا کرے۔ ان سارے بیتے سالوں میں جب سے آبگی ینے سید گوشہ نشین

ہوئی تھیں، یہ پہلی مرتبہ تھا کہ شانزے نے اُنہیں دیکھا تھا۔ صدمہ اتنا گہرا تھا کہ وہ خود نہ سنبھل پائی تھی عائلہ کو کیا سنبھالتی۔

پر وہ عائلہ سے یہ سب کیوں کہہ رہی تھیں، اس نے سوچا۔ عائلہ کا خیال آتے ہی وہ اُس کی طرف پلٹی۔ پر عائلہ تو جانے کب بے سدھ ہو کے زمین پہ گر چکی تھی۔

گائوں میں رہتے اسے ایک سال ہونے والا تھا۔ وقت تھا کے پر لگا کے اڑے جا رہا تھا۔ وقت ویسے بھی کہاں رکتا ہے اور کس کے لیے رکتا ہے۔ وقت تو وہ سر پھرا باز ہے جو جب اڑان بھرتا ہے، تو مڑ کے نہیں دیکھتا، روز نئی منزلیں سر کرتا ہے۔

آبگینے کی باتوں کا اثر زائل ہوتے مہینے لگ گئے تھے۔ اس دن ہوش میں آنے کے بعد کئی دن عائلہ بخار میں پھنکتی رہی۔ شانزے اور چچی، اس کی مکمل صحت یابی تک اس کے ساتھ رہیں۔ عائلہ کو بخار نے تو چھوڑ دیا، مگر آبگینے کی باتوں کا آسیب اس کے ذہن و دل پہ چھا گیا۔ وہ بہت کوشش کرتی اپنا ذہن بٹانے کو، یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، باغیچے پہ توجہ دینے لگی، حویلی کی تفصیلی صفائی کرائی، ماہ پری سے اپنے

بچپن کے قصے سنتی،اپنی واحد سہیلی شانزے کے ساتھ وقت گزارتی،پر...آبگینے سید کے الفاظ اس کے ذہن سے نہ جاتے۔

اکثر عبداللہ کا تصور اور آبگینے سید کے لفظوں کا تال میل اسے اچھا لگنے لگتا۔وہ عبداللہ کو سوچتی تو کانوں میں ان کی آواز گونجتی:

"ذات نہ دیکھ جھلیے بس عشق کر عشق۔"

اس کا دل ہر ذات پات کے فرق کو بھلا دیتا۔نہ بابا یاد آتے،نہ معید لالا سے کیا وعدہ ،نہ اماں کی تربیت پہ لگنے والی تہمتوں کا خیال آتا،نہ اپنی زندگی کا۔

اس کا دل بغاوت پہ ہمکنے لگتا۔وہ سر جھٹکتی،استغفار پڑھتی،پر کانوں میں گونجتی آواز خاموش نہ ہوتی۔

www.novelsclubb.com

"چاہ نہ چھوڑ،مجھ جیسی ہو جائے گی۔"

عائلہ بے ساختہ کانوں پہ ہاتھ رکھ دیتی،آواز مزید گونجتی:

"ذات نہ دیکھ جھلیے، ذات کی کیا اوقات؟"

عائلہ کتاب کھول لیتی۔ کتاب کے سارے لفظ مٹ جاتے، صرف ایک سطر لکھی دکھائی دیتی:

"تم بھی باغی ہو۔"

وہ کتاب بند کر کے وضو کرنے چلی جاتی۔ آواز اب بھی آتی۔

"دل دیکھ، روح دیکھ، عشق دیکھ۔"

شہادت پڑھتی، آواز بلند کر دیتی تو کانوں میں گونجتی آواز بھی بلند ہو جاتی:

"باقی سب چھوڑ، باقی سب مٹی، بس عشق کر عشق۔"

www.novelsclubb.com

عائلہ کانوں پہ ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگتی۔ یہ کیا روگ لگا دیا مولا۔ مشکل سے تو میرے دلِ بے قرار کو صبر آیا اور میں نے خود کو آمادہ کیا تھا "عبداللہ" کو بھلا دینے پہ لیکن یہ کون سا آسیب چمٹ گیا مجھ سے؟

وہ روتی اور سوچتی جاتی کیا کرے۔

اس کا دل تو خاموش جھیل کی طرح پر سکون ہو چکا تھا جس کے بیچوں بیچ ایک ننھے سے جزیرے پہ اپنی محبت کی قبر بنا،اس کے کتبے پہ وجہِ موت ''ذات پات'' جلی حروف میں رقم کر چکی تھی۔ہر شام کچھ دیر اس قبر پہ گزارتی۔یادوں کے کچھ پھول نچھاور کرتی،نارسائی کے آنسو بہاتی اور لوٹ آتی۔

مگر آبگینے سید سے اس کی ملاقات نے تو اس کی دنیا ہی بدل دی۔دل کے پر سکون جھیل میں سمندر سا تلاتم برپا ہوا اور محبت کے جزیرے کو بہالے گیا۔قبر سے آزاد ہوئی محبت،کسی بدروح کی طرح اس کے گرد،دائروں میں چکر کاٹتی رہتی۔

کافی عرصہ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس آسیب سے بچ نکلے،مگر آخر کار وہ اس آسیب کے شکنجے میں پھنس ہی گئی۔پورے ایک سال بعد اس نے قبول کیا تھا کہ وہ سچ مچ باغی ہے۔

اس کی روح تو شاید بچپن ہی سے باغی ہے۔بس وجود ہی ہے جو کٹھ پتلی کی طرح روایات،ذات پات اور خود کو عظیم تر بنانے کی تگ ودو میں مصروف ہے۔

کیا کبھی باغی روح اور مقید وجود والے لوگ دیکھے ہیں کسی نے؟

ہمارے ارد گرد اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محفلوں میں یا تنہائی میں خاموش ہی رہتے ہیں۔جن کے چہروں پہ زردی ملی اداسی اور آنکھوں میں اشکوں کی چمک واضح ہوتی ہے۔لباس ملگجے اور شخصیت سوگوار رہتی ہے۔لہجے شیریں مگر الفاظ تلخ ہوتے ہیں۔

انہی لوگوں میں بلا کا ٹھہراؤ بھی ہوتا ہے۔اگر آپ کی نظر ایک دفعہ ان پہ پڑھ جائے تو اِس مقفل خزانے کو کھولنے کا احساس اس قدر مچلے گا کہ آپ خود ان کے گرد منڈلانے پہ مجبور ہو جائیں گے۔پر وہ پھر بھی خود میں گم صم رہتے ہیں۔کیوں کہ ایسی باغی روحیں اپنے اندر اس قدر بلا کا طوفان برپا رکھتی ہیں کہ اُنہیں اپنے گرد رہنے والوں کا خیال ہی نہیں آتا۔

بس روح اور وجود کے بیچ کی جنگ میں ان کی شخصیت کھو سی جاتی ہے۔

عائلہ بھی کھونے لگی تھی۔ سجنا سنورنا، پہننا، اوڑھنا، سب بھول سیاہ سلوٹ زدہ قمیص شلوار پہنے رکھتی۔ زیور کے نام پہ وہ واحد ہیرا اس کی چھوٹی سی ناک میں چمکتا رہتا۔ چمکدار بھورے بال ڈھیلی سی چوٹی میں گندھے نظر آتے۔ تعلیم میں بھی اس لیے دل چسپی باقی تھی کہ اردو ادب سے لگاؤ باقی تھا۔

چچی اس کی حالت دیکھ، ہولتیں رہتیں، جب کے شانزے روز کوئی نیا مشغلہ ڈھونڈ، حویلی آدھمکتی۔ پر جب عائلہ کا دل ہی اُٹھ گیا تھا، تو یہ سب بے کار ہی جانا تھا اور گیا بھی۔

چچی نے کھانے پہ بہت اہتمام کیا تھا۔ عائلہ بار بار شرمندہ سی کہتی:

"اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی چچی، بس آپ کے ہاتھ کی "خروت" ہی کافی تھی۔"

خروت بلوچستان کی مشہور سوغات تھی۔ سردیوں میں دودھ سے پنیر بنا کے اسے ململ کے کپڑے میں ڈال کے کسی ٹھنڈی سایہ دار جگہ پہ لٹکا دیا جاتا۔ جب پنیر کا سارا پانی نکل جاتا، تو اس کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کے سکھا لیے جاتے ہیں۔ جنہیں پھر سالن بنانے کے وقت گرم کھولتے پانی میں بھگو کے پیسا جاتا اور انہی کا سالن بنایا جاتا۔ بلوچستان کی اس سوغات کے چرچے دور دور تک ہیں۔

عائلہ کو بھی خروت بہت پسند تھا۔ تبھی چچی نے خاص طور پہ اس کے لیے بنایا تھا۔ خوب خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا اور پھر میٹھا۔

بعام سے فراغت کے بعد چچی دستر خوان سمیٹوانے لگیں۔ جب کہ شانزے اور علیزے نے باغ میں پردے کا انتظام کرایا اور عائلہ کو ساتھ لیے باغ کی سیر کو نکلیں۔ اوائلِ اپریل کے دن تھے۔ جب اس کے گائوں کی دھوپ گرم اور چھائوں سرد ہوتی ہے۔ باغ اب بھی پہلے جیسا تھا۔ خوبصورت، تروتازہ، رنگ و خوشبو سے سجا ہوا۔ شانزے اور علیزے اس کے ساتھ چلتے چلتے تھک گئیں تو جھرنے کے

کنارے بیٹھ گئیں۔ جھرنے کے ٹھنڈے میٹھے پانی میں پیر ڈالنے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ عائلہ کا بھی دل چاہا کے ان کا ساتھ دے پر اسے چیری کے درختوں تک جانا تھا۔

ابھی تو صرف بادام اور خوبانی کے درختوں کو ہی دیکھ پائی تھی۔پر باغ میں ہوا کے ہر آتے جاتے جھونکے سے چیری کی خوشبو آرہی تھی۔اس نے حویلی کے صحن میں ڈھیروں گلابی پھول بکھرے دیکھے تھے۔یہی گلابی پھول تو وہ خود پہ بکھرتے پھر سے محسوس کرنا چاہتی تھی۔

خیالوں کے جہاں میں گم،وہ تب چونکی جب اس کے پیر گلابی پھولوں کی دبیز چادر پر پڑے۔

جھکی پلکیں اٹھی تھیں۔سامنے ڈھیروں قطار سے لگے چیری کے درخت جو گلابی پھولوں کے پیرہن اوڑھے،شان سے کھڑے اسی کے منتظر تھے۔ایک گہری سانس لے کے اپنے ارد گرد پھیلی روح تک کو تروتازہ کر دینے والی خوشبو اس نے اپنے اندر اتاری۔اپنے پیروں کو سلیپر کی قید سے آزاد کرتے اگلے پل وہ درختوں

کے نیچے بچھی پھولوں کی نشست پہ جا بیٹھی۔ کیا اس سے بڑھ کہ کوئی حسیں منظر ہو سکتا ہے؟ درخت کے خوشبودار تنے پہ سر ٹکاتے اس نے سوچا تھا۔

ہوا کے ٹھنڈے جھونکے اس کے چہرے پہ آتی بھوری لٹوں کو تھوڑا اور چھیڑ رہے تھے۔ جانے کتنے پھول جھڑ کے عائلہ پہ بکھرے تھے۔ وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

دور پردے کا انتظام دیکھتا میر شاہ زین سید چونکا تھا۔ یہ کس کی ہنسی تھی؟ اسے تجسس ہوا۔

ہنسی کی آواز کے سمت قدم بڑھاتے شاہ زین کو سامنے چیری کے درختوں کے نیچے بیٹھی عائلہ نظر آ گئی۔ اس کی پشت ہونے کی وجہ سے وہ پہچان گیا تھا کہ یہ علیزے یا شانزے نہیں ہو سکتیں کیوں کہ مقابل کے بال بے حد لمبے اور دھوپ میں سونے کی طرح چمک رہے تھے۔

#عشق_لا

فریال سیّد

قسط نمبر 4

جب سے وہ لوگ اس حویلی میں منتقل ہوئے تھے اس نے کبھی عائلہ کو نہ دیکھا تھا۔ وہ شانزے کی ہم عمر تھی اور شاہ زین سے دو سال بڑی۔ بچپن میں ساتھ پلے بڑھے تھے، تجسس نے پھر انگڑائی لی اور دل اس کا چہرہ دیکھنے کو مچلا۔ شاہ زین نہایت احتیاط سے دبے قدموں چلتا درختوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ اب وہ عائلہ کو دیکھ سکتا تھا گو سامنے سے نہیں...

سفید لباس میں ملبوس، درخت کے تنے پہ سر ٹکائے آنکھیں موندے وہ جانے کیا سوچے مُسکرا رہی تھی۔ گلابی رنگ پہ اڑتے سونے جیسے بال اس کے چہرے کو یونانی حسن کی رمق بخش رہے تھے اس کی ناک کا چمکتا نگینہ اور لمبی پلکیں حسن کو کامل کر رہی تھیں۔ دودھیا پیر گلابی پھولوں پہ ٹکے اتنے چمک رہے تھے کہ جیسے پھولوں پہ ہی رکھنے کو تخلیق کیے گئے ہوں اور ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپٹے نور کا ہالہ سا بنا رہے تھے۔

کیا یہ وہی عام سی عائلہ تھی جس کے ساتھ اس کا سارا بچپن گزرا تھا؟ وہ اور معید لالا مل کے اسے کتنا ستاتے تھے۔ موقع ملنے پہ وہ بھی شاہ زین کو ایک دو جڑ کے اپنے بڑے ہونے کا رعب جماتی۔ کچھ تو خاص ہے اس عائلہ میں کچھ نیا۔ اتنا مسحور کن حسن، اتنا کامل منظر۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑی تھی کہ ہوا چلی اور عائلہ پہ پھول برسا گئی۔ اب کے پھر سے وہ کھلکھلائی اور یونہی آنکھیں موندے بیٹھی رہی۔ کئی پھول اس کے گود میں گرے اور کئی بالوں میں اُلجھ چکے تھے۔

www.novelsclubb.com

شاہ زین اس کی ہنسی کے زیرِ اثر بت بنا سانس روکے درختوں کی اوٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔اس کا دل چاہا کہ پھر سے ہوا چلے اور چیری کے پھول اس پیاری سی لڑکی کو گدگدائیں، مگر ہوا تھی کہ نخرے دکھانے لگی۔نہ ہوا چلی نہ وہ کھلکھلائی۔

شاہ زین کو خیال آیا کیوں نہ درخت کو ہلکا سا جھٹکے اور اس پہ پھول برس جائیں۔اس خیال کا آنا تھا کہ وہ درخت کے پاس گیا جس سے ٹیک لگائے عائلہ بیٹھی تھی۔ درخت کی اوٹ میں کھڑے،اس نے کچھ شاخوں کو پکڑ کے دھیرے سے جھٹکا۔ گلابی پھول عائلہ پہ بکھرے تھے۔کچھ پھول پیشانی،رخسار اور ہونٹوں کو چھو کے نیچے گرے تھے۔

عائلہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔موندی آنکھوں سے کھلکھلاتی وہ بے حد دلکش لگی تھی۔شاہ زین کے دل نے اسے مزید مجبور کیا۔دوبارہ شاخیں جھٹکتے،اس نے عائلہ پہ گلابی پھولوں کی بارش کی تھی۔

اب کے عائلہ چونکی۔اس نے آنکھیں کھولیں تواس کی نظر درخت کی اوٹھ سے خود کو دیکھتے شاہ زین پہ پڑی۔ بجلی کی سی تیزی سے سیدھے ہوتے اس نے اپنا دوپٹا درست کیااور نقاب کے انداز میں آدھا چہرہ ڈھکا تھا۔ عجلت سے پیروں میں سلیپر اڑستے وہ جانے کو مڑی کہ شاہ زین اسے پکار بیٹھا:

"سنیں عائلہ!"

عائلہ کے آگے بڑھتے قدم تھم گئے تھے۔

"مجھے معاف کر دیں، میں آپ کو..."

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ آدھا چہرہ ڈھکے، دو شہد رنگ قہر برساتی نگاہوں نے شاہ زین کو پتھر کا بنا دیا۔ شرمندگی کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ وہ نظریں جھکا گیا۔ گلابی پھولوں کو روندتی، عائلہ کے قدموں کے سنگ اس نے اپنے دل کو بھی رندتے محسوس کیا تھا۔

عائلہ کے امتحانات ختم ہو گئے تھے۔لالا نے اس کی واپسی کا سارا انتظام کر دیا تھا۔ واپس جانے سے ایک رات پہلے،وہ کمرے میں بیٹھے بیٹھے اکتا سی گئی۔نیند جو ویسے ہی اس پہ کم مہربان تھی،آج تو جیسے نہ آنے کی قسم کھا چکی تھی۔

مجبور ہو کے عائلہ نے سوچا کیوں نہ صحن میں تھوڑی دیر ٹہلا جائے۔چپل میں پائوں اڑستے دالان سے گزرتے،رنگین دریچوں سے آتی پورے چاند کی روشنی، عجب سرور سا برپا کر رہی تھی۔سفید حویلی چاندنی میں نہا کر مزید حسین اور پر سرار لگ رہی تھی۔ماربل کی روش ختم ہوئی تو اس کے پیر شبنم میں نہائی گھاس پہ پڑے ۔پیروں کو سلیپر سے آزاد کرتی وہ بھیگی گھاس پر چلنے لگی۔

اسے لگتا،چاند اس کا پیچھا کر رہا ہے جس طرف وہ جاتی،چاند اپنی جگہ بدلتا،اسے تکتا ۔چاند سے آنکھ مچولی کھیلتے اسے جانے کتنی دیر ہو گئی،آخر وہ تھک کے سنگِ مرمر کے زینے پہ بیٹھ گئی۔

ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ جماتے،اس کی نظریں اب بھی چاند پر تھیں۔

"کاش! عبداللہ بھی اس وقت اسی چاند کو دیکھ رہا ہو۔"

خیال کی شدت اتنی تھی کہ وہ یونہی چاند پہ نظریں ٹکائے، بت بنی بیٹھی رہی۔اس کی پلکوں کو چھوتے کئی موتی، اس کے زردی مائل رخسار پہ بکھرے تھے۔سیاہ ماتمی لباس چاندنی میں مزید ملگجا سا لگ رہا تھا۔

ہم تیری یاد منانے کے لیے

ہر طرف عالمِ ہو ڈھونڈتے ہیں

ایک بھولے بسرے شعر نے اس کے ہونٹوں پر دم توڑا تھا۔کچھ اس کے شہر میں واپس جانے کی اداسی تھی اور کچھ اسی شہر سے جڑے درد کے قصے تھے۔عائلہ کا دل بھرا گیا۔گھٹنوں میں چہرہ چھپائے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

اسے وہیں سسکتے جانے کتنی دیر ہو گئی جب کسی کے دستِ شفقت کو اپنے بالوں پہ محسوس کرتی وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔اپنے ساتھ، بالکل قریب بیٹھی آبگینے سید پہ نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے پیچھے کی طرف کھسکی۔

"نہ عائلے نہ بچے! یوں روتے نہیں۔بہادر بن۔جب عشق جیسا بہادری کا کام کر لیا ہے، تو اب درد سے کیا ڈرنا؟ اب تو زندگی زرد ہی گزرنی ہے، تو رونا کیسا؟"

اس کے آنسو نرمی سے پونچھتی آبگینے اسے اپنی اپنی سی لگیں۔وہ مبہوت سی انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

"چاند کو دیکھ عائلے۔حسین ہے نا؟"

ان کے سوال پہ عائلہ نے ٹرانس کی سی کیفیت میں اثبات میں گردن ہلائی تھی۔

"تمہیں پتا ہے چاند کیوں حسین ہے؟"

عائلہ کے نفی میں سر ہلانے پہ وہ بولیں:

''غور سے دیکھو تمہیں چاند میں داغ دکھائی دے رہے ہیں؟اجلے، گورے، چاند پہ یہ داغ ہی اسے مختلف اور پراسرار حد تک حسین بناتے ہیں۔اگر چاند پہ داغ نہ ہوتے تو چاند عام سا ہوتا۔بالکل ویسے جیسے، ہمارے ارد گرد بہت سے خوش شکل، اجلے اور خوش باش لوگ پائے جاتے ہیں، مگر ان میں کچھ بھی پرکشش حد تک مختلف نہیں ہوتا۔کیوں کہ اُن کا وجود بے داغ ہوتا ہے۔عام سا اور کبھی کبھار ہم کسی واجبی انسان میں کچھ بہت پرکشش، بہت مختلف محسوس کرتے ہیں، تو پتا ہے تمہیں وہ کشش کیا ہے؟''

''وہ ان کے وجود کے زخم ہیں۔ان کی روح پہ لگے داغ ہیں جو انہیں منفرد بناتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے ایک دانشور کا قول ہے کہ دنیا کی سب سے خوبصورت مُسکراہٹیں وہ ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہوں یعنی جن میں درد کی آمیزش ہو اور درد ہر ایک کا مقدر تو نہیں نا میری جان؟درد تو اللہ کے چنے ہوئے بندوں کو نصیب ہوتا ہے، جن کے لیے عشق کے در وا کر دیے جاتے ہیں۔ہر کسی کے سینے پہ زخمی دل کا تمغہ،

www.novelsclubb.com

عشق کی شہادت نہیں دیتا۔یہ کچھ چنے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔جیسے کہ میں...جیسے کہ تم۔"

عائلہ نے سراسیمگی سے ان کے چہرے کو دیکھااور پھر ہکلاتے ہوئے پوچھ بیٹھی:

"کیاآپ نے بھی عش...شق۔"

"عشق؟"

"شدید عشق...بے تحاشا۔"

آبگینے نے اس کے ادھورے سوال کاخود ہی جواب دے دیا۔

"توکیاوہ کم ذات تھا؟"

www.novelsclubb.com

عائلہ نے ڈرتے ڈرتے پھر سے پوچھا۔

"کم ذات؟کم ذات پہچانتی ہو؟وہ جو ہوس کو عشق کا پیرہن پہنائے وہی ہوتے ہیں کم ذات...

اور وہ تو اتنا اعلیٰ ظرف تھا کہ میرے سائے کی بھی عزت کرتا تھا۔وہ کم ذات کیسے ہو سکتا تھا؟

"کیسے؟"

عائلہ نے شرمندہ ہوتے ہوئے دوبارہ پوچھا:

"وہ میرا مطلب تھا کہ کیا وہ ہم ذات نہ تھا؟"

اب کے آبگینے بولی تو لہجہ بیگانہ تھا:

ہم ذات؟

کیا ایک ذات کا ہونے سے ہی بندہ ہم ذات بنتا ہے؟

www.novelsclubb.com

ذات،رنگ، نسل،نام،رتبہ، عشق کیا جانے؟

عشق کے لیے تو ہم ذات وہی ہے جو آپ کی رگ وپہ میں سرایت کر جائے جس کی روح اپنا وجود چھوڑ،آپ کے وجود میں آبسے۔

وہ ہم ذات بھی تھا اور ہم جان بھی۔

''وہی تو تھا سب کچھ۔ وہی تو ہے۔ صرف وہی تو ہے۔''

گھاس میں کچھ ٹٹولتی، اب وہ خود ہی سے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں مخاطب تھیں۔

عائلہ حیرانگی اور افسوس کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ان کی تکلیف کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ انسان کس قدر درد سے گزرا ہو گا جس کے سامنے کوئی ذکر کر دینا اسے ہوش و خرد کے جہاں سے بیگانہ کرنے لگے؟

''اماں کا کی... اماں کا کی۔''

www.novelsclubb.com

عائلہ نے اُنہیں زبردستی اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

وہ اپنی وحشت زدہ نظروں سے عائلہ کو دیکھنے لگیں۔

''کیا ستی بننے کا فیصلہ آپ کا اپنا تھا؟''

عائلہ نے مزید ہمت کر کے اُنہیں کریدا۔

جواباً آبگینے سید کی ہذیانی ہنسی نے اسے خوف زدہ کر دیا۔

"جب سزائے موت کے دو طریقے سامنے رکھے جائیں۔ پہلی، پوری دنیا کے سامنے سولی پہ لٹکائے جانے کی سزا اور دوسری، اکیلے بند کمرے کے پیچھے روز سولی پہ لٹکنے کی، تم کون سا چنو گی؟ عزت بچا کے بند کمرے کی موت یا سرِ عام پھانسی؟ میرے سامنے دو ہی راستے رکھے گئے۔ شادی کر کے کسی کی وفا شعار بیوی بننے کی اداکاری۔

یا پھر بند کمرے میں تمام عمر قیدِ تنہائی۔

میں مر کے بھی منافقت کی زندگی نہ چنتی تبھی میں نے عمر قید کا انتخاب کیا۔

بند کمرے میں قید ہو گئی۔

اِسی بند کمرے میں تو میں نے اسے پایا ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ مجھ میں رہتا ہے میرے اندر رہتا ہے۔ مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ میرے ساتھ ہنستا ہے روتا ہے، جاگتا سوتا ہے۔ وہ مجھ میں دکھائی دیتا ہے۔ کیا تمہیں بھی دکھ رہا ہے وہ، بتا؟"

"بتا ناں۔"

وہ بچوں کی طرح عائلہ کے ہاتھ جھٹک جھٹک کے پوچھ رہی تھیں۔ عائلہ کے پاس ان کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموشی سے ان کا نحیف چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"سنو! اس کی آواز سنو۔ وہ میرے اندر ہے۔ اس کی آواز آ رہی ہے تمہیں؟

وہ بول رہا ہے۔ "می رقصم" ہاں!

www.novelsclubb.com

می رقصم

سنو...

ٹوٹے پھوٹے لفظ، وحشت زدہ چہرہ، بکھرے بال، سیاہ لباس۔ آج عائلہ کو ان سے خوف نہیں بلکہ ترس آرہا تھا۔ کتنے خوبصورت انسان، زمانے، معاشرے، روایات اور ''لوگ کیا کہیں گے'' کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

کیا روایات اور اصول، انسانی زندگی اور خوشی سے بڑھ کے ہیں؟

اپنے خیالوں میں گم عائلہ چونکی۔ آبگینے جانے کب اٹھ کے جا چکی تھیں۔ عائلہ نے ان کی تلاش میں نظر دوڑائی۔

سامنے سفید سنگِ مرمر کی روش پہ وہ کچھ گنگناتی، گول دائروں کی صورت گھوم رہی تھیں۔

ایسے کے ان کا ایک ہاتھ ہوا میں معلق تھا، جیسے انہوں نے کوئی رسی تھام رکھی ہو اور دوسرا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔

عائلہ نے کوشش کی کے سن سکے وہ کیا گنگنا رہی تھیں۔

فارسی کے کچھ میٹھے گہرے لفظ اس کی سماعت تک پہنچے وہ حیران رہ گئی۔

کیا بند کمرے میں آبگینے نے علم حاصل کیا تھا؟

یا ادب پڑھا تھا؟

کیسے شیخ عثمان مروندی کے یہ خوبصورت الفاظ اُنہیں ازبر تھے؟ اسے یاد تھا اُنہیں ادب سے کبھی شغف نہ رہا تھا اور اب وہ اشعار گنگنا رہی تھیں۔ کیا ادب کا عشق سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ کسی بھی بے ادب عاشق کو باادب کر دیتی ہے؟

وہ گنگنا رہی تھیں اور گول دائروں میں گھوم رہی تھیں۔

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم

www.novelsclubb.com

مگر نازم بہ ایں ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم

تو آں قاتل کہ از بہرِ تماشا خونِ من ریزی

من آں بسمل کہ زیرِ خنجرِ خوں خوار می رقصم

بیا جاناں تماشا کن کہ درانبوہِ جانبازاں

بہ صد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم

می رقصم...

می رقصم...

می رقصم...

می رقصم کہتی ان کی آواز بلند اور گھومنا تیز ہوتا گیا۔اتنا تیز کے اب عائلہ کو لگنے لگا انہوں نے بیچ میں کوئی ان دیکھی رسی تھام رکھی ہے جس کے سہارے وہ اتنا تیز گھوم رہی تھیں۔

www.novelsclubb.com

دوپٹا کب کا گر چکا تھا۔لمبے روکھے بکھرے بال چہرہ ڈھانپ رہے تھے۔ان کے عین اوپر پورے چاند کی روشنی اور پیچھے چاندنی میں نہائی ویران سفید حویلی۔عائلہ کو یہ سب بہت پراسرار سا لگا۔

اس کی نظریں سفید سنگِ مرمر پہ تیزی سے حرکت کرتے ان کے پیروں پہ گئیں۔

خوف کی ایک شدید لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔اسے لگا جیسے آبگینے کے پیروں کے ساتھ دو اور بھی پیر محوِ رقص تھے۔خوف زدہ نگاہیں ان کے وجود پہ گئیں۔ادھر بھی آبگینے سید کے سیاہ پیراہن کے ساتھ کسی کے سفید پیراہن کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی تھی۔

ایک ہاتھ کی جگہ اب دو ہاتھ اس ان دیکھی رسی کو تھامے ہوئے تھے۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی عائلہ ڈگمگاتے قدموں سے بہ مشکل حویلی کی طرف بھاگی۔حواس باختہ سی مسہری پہ ڈھیر ہوتے ہوئے،اس نے سرتاپا خود کو کمبل میں چھپالیا۔تھر تھر کانپتے،وہ جلد صبح ہونے کی دعائیں مانگنے لگی۔وہ رات کافی بھاری گزری تھی۔

اگر اسے ذرہ برابر بھی اندازہ ہوتا وہ ایسا منظر کبھی بھی دیکھے گی، وہ مر جاتی مگر اس حویلی میں کبھی یوں اکیلی نہ رہتی۔اب بھی کل رات کے اس ہول ناک منظر کو یاد کرتے، اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔عائلہ نے بے ساختہ جھرجھری لی تھی۔

ان دو سالوں کی روداد اس کی نظروں کے سامنے کسی فلم ہی کی طرح تو دوڑ گئی تھی ۔

ہاتھ میں وہ بے وزن غزل تھامے، ماضی کھنگالتے، اسے جانے کتنی دیر ہو گئی تھی کہ دوپہر کا چلچلاتا سورج الوداع کہتا، غروب ہونے کو تیار کھڑا تھا۔

عائلہ نے کاغذ واپس کتاب میں رکھا اور مغرب کے لیے وضو کرنے چلی گئی۔

ابھی مکمل وضو بھی نہ کیا تھا کہ اذان شروع ہو گئی۔

"اشہد وانا لا الہ الا اللہ واشہد وانا محمد۔"

چہرے کے گرد انگلیاں مس کرتے ہوئے،اس کی زبان نے اتنا ہی کہا تھا کہ ''اللہ اکبر'' کہتی آواز نے اس کے وجود کو پتھر کا بنا دیا۔وہ حیران نگاہوں سے اپنے ہی خالی چہرے کو سامنے لگے وسیع آئینے میں تک رہی تھی۔

''اشہد وانالاالہ الااللہ۔''

یہ شہادت دیتی آواز بے شک ''اس'' کی تھی،اس کے دل نے بھی شہادت دی۔

عائلہ سب چھوڑ چھاڑ اپنے کمرے سے منسلک ٹیرس کی طرف بھاگی۔

فلاح کی دعوت اب اور بھی زیادہ قریب سے سنائی دینے لگی۔

''حی علی الصلاح''

www.novelsclubb.com

عائلہ کی روئی روئی تھکاوٹ سے چور آنکھیں اب کے شکرانے کے آنسو بہا رہی تھیں۔

''حی علی الفلاح''

وہ وہیں ٹیرس میں سجدہ میں گر چکی تھی۔

"اللہ اکبر، اللہ اکبر"

"بے شک اللہ ہی سب سے بڑا ہے، بے شک وہ ہی زبردست اور ہر شے پہ قابو پانے والا ہے۔"

عائلہ کے ہونٹوں نے وہیں سجدے میں ہی سرگوشی کی تھی۔

"لاالہ الااللہ..."

اذان مکمل ہو گئی اور ہر سو عالمِ ہو چھا گیا۔

عائلہ عجلت میں سجدے سے اٹھی اور دیوانہ وار ٹیرس سے نیچے دیکھنے لگی۔

www.novelsclubb.com

اسے پتا تھا کہ اس کے ٹیرس سے صرف ان کے گھر کے پیچھے واقع غیر آباد سنسان پلاٹس ہی دکھتے تھے۔ پھر بھی اس نے کوشش کی کہ شاید، اس کی ایک جھلک دکھ جائے۔

اس کی؟

اس کی کہ جس نے صرف عائلہ کی سماعت تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے ان کے علاقے کی مسجد میں اذان دی تھی۔

اس کی کہ جس کی یاد کا چراغاں عائلہ کے گرد ہر لمحے رہتا ہے۔

اس کی کہ جس کی آواز سے عشق پہلے اور خود اس سے بعد میں ہوا تھا۔

اس کی، یعنی ''عبداللہ'' کی۔

عائلہ کے عبداللہ کی۔

''عبداللہ کا سفر۔''''ماہا!''

www.novelsclubb.com

جائے نماز پہ بیٹھی صغریٰ بیگم کی آواز پہ، دبلی پتلی سی ماہا تقریباً بھاگتے ہوئے، مختصر سے صحن کے بیچ رکھے تخت تک آئی تھی۔ جہاں صغریٰ بیگم عشا کے بعد سے اب تک جائے نماز بچھائے بیٹھیں تھیں۔

فجر ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی، مگر صغریٰ بیگم کی آنکھوں سے بہتے آنسو اور لبوں پہ سسکتی دعاؤں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"جی امی۔"

بوکھلائی ہوئی، بیس سالہ ماہا نے امی کے چہرے کو فکر سے تکتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی خبر نہیں آئی اس کی؟"

امی جو سینکڑوں بار اس سے یہی سوال پوچھ چکی تھیں۔ایک دفعہ پھر سے پوچھتی، امید بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"نہیں امی کوئی خبر نہیں آئی۔"

www.novelsclubb.com

شرمندگی سے اپنی ماں کی آنکھوں میں امید کے بجھتے دیے دیکھ ماہا دوبارہ سے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے سے صحن تک کا فاصلہ بہ مشکل دس قدم تھا۔کمرے میں بچھی مسہری جس پہ بیٹھی وہ اپنے قریب سوئی ہوئی بارہ سالہ ثنا عرف چھوٹی کے چہرے پر پھیلے اطمینان کو رشک سے دیکھ رہی تھی،امی کی آنسوئوں میں تر دعا بہ آسانی سن سکتی تھی۔

"یااللہ کرم کردے۔اے مولا رحم کردے۔وہ میرا واحد سہارا ہے یااللہ اسے مجھ سے نہ چھین۔اس گھر کا سائباں اب وہ ہے۔سکندر کو کھو دیا،یااللہ مجھ سے میرا بیٹا نہ چھیننا۔اس کی کوئی تو خبر لادے مولا۔میں بہت لاچار ہوں۔دو یتیم بیٹیوں کا ساتھ ہے مولا،اس سیلاب جیسے شہر میں اسے کہاں ڈھونڈتی پھروں خدایا۔اس کی حفاظت کر۔اسے دشمن کے شر سے محفوظ رکھ خدایا۔میں نے آج تک تیری کسی آزمائش پہ اف تک نہیں کی مشکل سے مشکل وقت ثابت قدمی سے گزارا۔دس سال کی بیوگی کاٹی،ہر مشکل جھیلی صرف اپنے بڑھاپہ کے اس واحد سہارے کے آسرے مجھ سے میرا شہزادہ نہ چھیننا مولا۔اس کی خبر لادے۔"

www.novelsclubb.com

فجر کی اذان ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی۔اپنی دعامیں مگن،پریشان حال صغریٰ کو اذان کا دھیان ہی کہاں رہا تھا۔

اچانک اس بوسیدہ ٹیلی فون کی گونج دار آواز پہ کمرے سے ننگے پیر نکل کے بھاگتی ماہا اور سجدے میں دعا مانگتی صغریٰ بیگم نے ایک ساتھ کہا تھا"یااللہ رحم۔"

ہیلو کہتی ماہا،ہانپتے ہوئے مقابل کی بات سننے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک چیخ نما آواز میں بولی:

"ایکسیڈنٹ؟"

اس کے پاس کھڑی،پریشان حال ماں سہمی۔"یااللہ خیر۔"ماہا کے تاثرات پڑھنے کی کوشش میں ان کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

"اچھا کب تک گھر آسکیں گے وہ؟کیا ہم ان سے ایک دفعہ بات کر سکتے ہیں؟"

ماہا کے استفسار پر، ماں نے ریسیور کان سے لگا کے مقابل کا جواب سننا چاہا مگر ناچار۔

ماہا اگلے ہی پل ''وہ جیسے ہی جاگیں، ان سے کہیے گا کہ امی بہت پریشان ہیں ایک دفعہ گھر بات کر لیں۔'' کہتی فون رکھ چکی تھی۔

خدشوں میں ڈوبی اس کی امی اس کی طرف لپکی۔

''کون تھا، اس کی ہی کوئی خبر تھی نا کیسا ہے وہ؟ اور ایکسیڈنٹ؟''

''جی امی اسپتال سے فون تھا۔ بھائی کا معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ کچھ ہلکے پھلکے زخم آئے ہیں۔ ابھی دوا کے زیرِ اثر سو رہے ہیں، جیسے ہی اٹھیں گے انہوں نے کہا وہ ہم سے ان کی بات کرائیں گے۔ ان کا فون بند ہو گیا تھا ورنہ وہ ہمیں پہلے ہی بتا دیتے فون کر کے۔''

www.novelsclubb.com

انہیں مطمئن کرنے کی کوشش میں ماہا زبردستی مُسکرائی بھی تھی۔ ورنہ اس کے دل کا حال بھی امی سے جدا نہ تھا۔

"یااللہ تیرا شکر ہے، یامولا تیرا کرم ہے۔میرے بیٹے کی خبر آگئی۔بے شک تو سننے والا ہے بے شک تونے مجھ گناہگار کی سن لی ہے۔میں تیرا کیسے شکر ادا کروں میرے مولا۔"نم آنکھوں سے۔

پھر ماہا کو دیکھتے ہوئے بولیں:

"چلو جلدی ورنہ فجر قضا ہو جائے گی اور شکرانے کے نفل بھی تو ادا کرنے ہیں۔"

اگلے ہی پل دونوں ماں بیٹی، باہر تخت پہ نماز فجر ادا کر رہی تھیں اور جو ماں ساری رات اس کی خیریت کی دعا کرتے نہ تھکی تھی۔دوپہر ہونے تک شکرانے کے نفل ادا کرنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

ایسی ہی ہوتی ہیں اکلوتے بیٹوں کی مائیں جس طرح بیٹیاں، باپ کی چہیتی اور آنکھوں کا تارا ہوتی ہیں بالکل ویسے بیٹے مائوں کے لاڈلے اور کل کائنات ہوتے ہیں

اور پھر جن مائوں کے بیٹے اکلوتے اور ان کے گھر کا واحد سائباں ہوتے ہیں، ان کی تو جان ہوتی ہے بیٹوں میں۔

عبداللہ بھی صغریٰ بیگم کی جان اور دونوں چھوٹی بہنوں کی کل کائنات تھا۔

☆...☆...☆

فجر کی اذان ہونے والی تھی۔ سمندر کے نزدیک اور شہر کی رونقوں سے تھوڑا دور واقع، اس چھوٹی سی جھونپڑی میں، شاہ آغا فجر کے لیے اُٹھے تھے۔ پیلا بلب جلاتے ہی وہ ننھی سی جھونپڑی، زرد روشنی میں نہا گئی۔ ایک چارپائی، ایک صندوق، زمین پر بچھی بوسیدہ سی چٹائی اور پانی کا ایک مٹکا۔ اتنے تھوڑے سے سامان کے باوجود اس جھونپڑی کا مکین بہت امیر تھا۔

www.novelsclubb.com

خدا کے قرب کی امارت جو ہر قسم کی امیری، نام ورتبے اور شہرت سے بڑھ کر ہے۔ اُنہیں وہ حاصل تھی۔ بھلا جسے اللہ مل جائے اسے اور کسی چیز کی چاہ رہتی ہے؟

شاہ آغا نے مسجد جانے کی تیاری کی۔قریب ہی واقع عالی شان سی مسجد تک پہنچنے میں روز تقریباً پندرہ منٹ تو لگ ہی جاتے تھے، تبھی وہ فجر سے پہلے ہی مسجد کی طرف قدم بڑھادیا کرتے تھے۔اذان رستے میں ہو جایا کرتی اور شاہ آغا جب تک پہنچتے جماعت تیار ہوتی۔

اپنی ننھی سی جھونپڑی کا ٹوٹا پھوٹا لکڑی کا دروازہ، جبراً بند کرتے، زنجیر چڑھاتے، وہ مسجد کی طرف چل دیے۔ان کی چھوٹی سی کٹیا سے کچھ ہی دور شہر کا ایلیٹ علاقہ شروع ہو جاتا۔جہاں سے سمندر کی طرف انتہائی تیز روشنیوں والے قمقمے نسب تھے جن کی بدولت دور دور تک سمندر اور ساحلِ سمندر دیکھا جا سکتا تھا۔

شاہ آغا نے بھی یونہی چلتے چلتے، اچٹتی سی نظر سمندر پہ ڈالی ہی تھی کہ اُنہیں سمندر کے قریب کسی انسانی جسم کا ہیولا سا، پڑا دکھائی دیا۔

"یااللہ خیر۔" کہتے، وہ تیزی سے سمندر کی جانب بڑھ گئے۔ضعیف قدم کسی کی مدد کے خیال سے تیز تر ہو گئے۔

اس علاقے میں رہتے ہوئے اُنہیں کوئی پینتیس سال ہو چکے تھے۔اس ساحل اور شاہ آغا کی آنکھوں نے بہت سے ہولناک منظر دیکھے تھے۔جواں سال خودکشیاں، اغوا کے بعد قتل کر کے ساحل سمندر پہ لاش پھینکے جانے والے حادثات،لاوارث گلی سڑی لاشیں، جنہیں سمندر دور دراز علاقوں سے بہالے آتا تھااور پھر جن کی کوئی شناخت نہ ہو پاتی تھی۔غرض جتنی لکیریں ان کی آنکھوں کے گرد تھیں،اتنے ہی فسانے اور رازان کی آنکھوں میں پوشیدہ تھے۔

کسی ان ہونی کا خوف ان کے دل کی دھڑکن بڑھائے جا رہا تھا۔نزدیک پہنچنے پہ انہیں اندازہ ہوا کہ وہ کوئی ابنِ آدم تھا۔تقریباً ہانپتے ہوئے وہ اس کے قریب پہنچے۔

وہ کوئی نوجوان تھا جس کی ہلکی آسمانی شرٹ پہ جابجا خون کے دھبے تھے۔

www.novelsclubb.com

سمندر کی لہریں اس کے پیروں تک آتیں اور پھر سے لوٹ جاتیں۔اوندھا پڑا ہونے کی وجہ سے،شاہ آغا کے لیے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ مقابل میں زندگی باقی بھی تھی کہ نہیں۔

کپکپاتے ہاتھوں سے بہ مشکل انہوں نے اس کا چہرہ ایک طرف کیا تھا۔

وہ ایک اچھا خاصا خوش شکل نوجوان تھا۔شاہ آغا نے دل ہی دل میں اپنے خدشات غلط ہونے کی دعا کی تھی۔اپنی انگلیاں اس کی ٹھنڈی ناک پہ رکھتے ہوئے،انہوں نے محسوس کیا کہ ابھی اس کی سانسیں جاری تھیں۔انہوں نے نبض دیکھی۔وہ بھی سست روی سے چل رہی تھی۔

شاہ آغا نے اِدھر اُدھر مدد کے غرض سے کسی ذی روح کو تلاشا کہ اس چھے فٹ سے نکلتے ہوئے،اچھی قامت والے نوجوان کو اٹھا کے روڈ تک لے جا سکیں کیوں کہ یہ اکیلے ان کے بس کی بات نہ تھی۔

سامنے ہی انہیں،قریب واقعہ کیفے اور ریستوران کے گارڈز،ٹولی کی شکل میں مسجد کی طرف جاتے دکھائی دیے۔شاہ آغا نے اپنے وجود میں موجود ساری طاقت جمع کرتے ہوئے اُنہیں مدد کے لیے پکارا۔

فجر کا وقت ہونے کے باعث شور شرابانہ تھا تبھی ان پانچ گارڈز کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں شاہ آغا کو زیادہ دقت نہ ہوئی۔وہ تیزی سے ان ہی کی جانب آرہے تھے

۔

شاہ آغا نے اس کی شناخت کے غرض سے اس کے جیبوں کو ٹٹولا،تو ان کے ہاتھ میں موبائل آگیا جو سمندر کے پانی میں بھیگنے سے بند ہو چکا تھا۔

انہوں نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا،تو اس کا بٹوہ ہاتھ آیا۔انہوں نے عجلت میں شناختی کارڈ نکالا۔

یہی خوش شکل،مُسکراتا چہرہ،کارڈ پہ جگمگا رہا تھا۔

www.novelsclubb.com

نام...عبداللہ سکندر۔

وہ اتنا ہی دیکھ پائے تھے کہ گارڈز مدد کو آپہنچے۔ان کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے، انہوں نے اس کا بٹوہ اور فون اپنی جیب میں رکھ لیا۔

تیز روشنی نے اس کی ادھ کھلی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔

درد کی ٹیسیں تھیں کہ اس کے جسم کو کاٹ رہی تھیں۔

خالی خالی آنکھوں سے چھت کو گھورتا، وہ کافی دیر یونہی لیٹا رہا۔

آخر کہاں ہوں میں؟

اور یہاں کیسے آیا؟

اس کے ذہن میں سوالات ابھرتے ہی، اس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔

وہ یقیناً کسی اسپتال کے وارڈ میں تھا۔اس کے بستر کے گرد پردہ آویزاں تھا۔

بستر کے قریب ہی ایک شفقت سے بھرپور، سفید باریش، گلابی رنگت والے بزرگ، تسبیح کے دانوں پہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔

www.novelsclubb.com

وہ اس کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی مُسکرائے تھے۔

عبداللہ اُنہیں اجنبی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ ان بزرگ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میں ادھر کیسے پہنچا۔

ان کو بتانا چاہتا تھا کہ اسے تکلیف ہے۔اسے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی کسی تیز دھار آلے سے اس کے بدن کے ٹکڑے کر رہا ہو۔

بابا نے اپنی تسبیح مکمل کرتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے،اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے چہرے پہ پھونکا تھا۔

پھر مُسکراتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئے:

"اب کیسے ہو بیٹے؟کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

عبداللہ نے جواب دینے کی کوشش کی، لیکن پیاسے خشک ہونٹ ہلنے سے قاصر تھے۔اس نے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا:

"پانی۔"شاہ آغا نے قریب ہی رکھا پانی کا گلاس اٹھا کہ اسے سہارا دیتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا عبداللہ پانی پی چکا تو بہ مشکل کہہ پایا:

"مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے بابا۔"

شاہ آغا ایک دم شرمندہ سے ہوئے تھے۔

"مجھے معاف کرنا بچے! مجھے ڈاکٹر صاحب نے بتایا بھی تھا کہ تمہیں ہوش آئے تو اُنہیں مطلع کر دوں۔ کیوں کہ تمہیں درد کی کوئی دوا نہیں دی گئی تاکہ یہی درد تمہیں ہوش میں لا سکے۔ بس ابھی بلاتا ہوں اُنہیں۔"

دھیرے سے اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے وہ پردہ ہٹا کہ چلے گئے۔

عبداللہ پھر سے چھت کو گھورنے لگا۔ اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ یہاں اس طرح سے پڑا ہے؟

www.novelsclubb.com

تجسس نے چٹکی کاٹی تو وہ اپنا جائزہ لینے لگا۔

دایاں بازو پلاستر کی موٹی تہ کے اندر چھپا ہوا تھا۔ بائیں بازو کی مرہم پٹی کی گئی تھی اور ایک ڈرپ اس سے منسلک تھا۔

سر پٹی کی کئی تہوں کے باوجود درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

دونوں ٹانگیں جگہ جگہ سے پٹیوں میں جکڑی سن سی محسوس ہوتیں تھیں۔

ان سب کے علاوہ، اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

دو کرخت و بے رحم چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ اسے سب یاد آ گیا تھا۔

عائلہ سید کی دو الوداع کہتی، مایوس آنکھیں۔

www.novelsclubb.com

اپنا درد سے بلبلانا۔

ان مکروہ چہروں سے رحم کی التجا کرنا۔

اور پھر ان کا بے رحمی سے اسے زدوکوب کرنا اور سمندر کنارے پھینک جانا۔

وہ بڑی مشکل سے اٹھ کے بیٹھا تھا۔

آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھایا تھا، مگر اسے اپنی پروا کہاں تھی۔

وہ تو کچھ بھی کر کے کسی طرح بھی عائلہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔اس کی خیریت معلوم کر ناچاہتا تھا۔

گھومتے سر کو ایک ہاتھ سے دباتا، وہ درد کی شدت سے آنکھیں میچ گیا۔

کچھ چکر آنا کم ہوئے تو اس نے اپنے ہاتھ کو جھٹک کے ڈرپ کی سوئی نکالی۔خون کی پتلی سی لکیر تیزی سے اس کے ہاتھ سے بہنے لگی۔اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے،اس نے اپنے پیروں کو ہلایا۔

www.novelsclubb.com

درد نے سسکی کی مانند اس کے ہونٹوں کو چھوا۔

مگر ایک بار پھر عائلہ کے ریت پہ گھسٹتے وجود کی تلخ یاد،اس کے ٹوٹتے ارادے مضبوط کر گئی۔

پہلا پیر زمین پہ رکھتے اسے لگا جیسے اس کے پیروں تلے زمین نہیں۔ڈانواں ڈول سا ،اس نے دوسرا پاؤں بھی زمین پہ رکھا۔کچھ دیر وہیں بیٹھے،خود ہی اپنی ہمت بندھانے کے بعد،اس نے اپنے قدموں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔اپنے واحد تندرست ہاتھ سے بستر کا سہارا لیتے،وہ کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔تھر تھر کانپتے پیر اسے قدم اٹھانے سے روک رہے تھے اور فکرِ جاناں تھا کہ چلنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

اپنا پورا زور لگاتے ہوئے اس نے کانپتے وجود کے ساتھ پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ ڈاکٹر سمیت شاہ آغا واپس آ چکے تھے اور اب شدید حیرت کے عالم میں اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہے تھے۔

www.novelsclubb.com

ڈاکٹر تیزی سے عبداللہ کی جانب بڑھا:

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

عبداللہ نے پلاسٹر شدہ ہاتھ سے اپنے نزدیک آتے ڈاکٹر کو پیچھے دھکیلا۔

ڈاکٹر جو اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہ تھا، لڑکھڑایا۔ پھر جب تک سنبھلا، عبداللہ بستر کا سہارا چھوڑ تیزی سے قدم بڑھانے کی کوشش میں، بری طرح زمین بوس ہو چکا تھا۔ شاہ آغا، ڈاکٹر اور نرس اس کی جانب لپکے۔

عبداللہ جانا چاہتا تھا اور وہ کوشش بھی کر رہا تھا۔

مگر ڈاکٹر اور شاہ آغا مسلسل اسے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ جھٹکتا عبداللہ لگاتار جانے کی ضد کر رہا تھا۔

"وہ اسے مار دیں گے۔"

www.novelsclubb.com

"آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں؟"

"جانے دیں مجھے، میں نے اس کی بے گناہی کی گواہی دینی ہے۔"

"میری عائلہ پتا نہیں کیسی ہو گی۔"

درد، وحشت، فکر۔ عبداللہ سکندر کے لہجے میں چیخ چیخ کر بولتے یہ تینوں عنصر، عشق کی نشاندہی کر رہے تھے۔ وہ کیا خوب کہتے ہیں، عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔

شاہ آغا کی سمجھ میں بھی ساری بات آنے لگی تھی۔ وحشت سے چیختے، اس شاندار نوجوان کو گہری نظروں سے تکتے، وہ پیچھے ہٹ گئے۔

عبداللہ جو پہلے ہی قابو میں نہیں آ رہا تھا اب تو اسے کنٹرول کرنا ڈاکٹر کو ناممکن سا لگا۔

"نرس! انجکشن تیار کرو۔ جلدی۔"

نرس کو ہدایات دیتا ڈاکٹر بہ مشکل عبداللہ کو قابو کیے ہوئے تھا جس کی برداشت اب آخری حد کو چھو رہی تھی اور وہ زور زور سے چلانے لگا۔

اس کا سارا وجود وحشت میں ڈوبا ہوا تھا۔اپنے درد کا احساس اسے جیسے تھا ہی نہیں۔

کئی زخموں کے ٹانکے ادھڑ چکے اور ان سے خون رس رہا تھا اور وہ تھا کہ جانے کی ر

ٹ لگائے، بے دردی سے اپنا سر پیچھے فرش پہ پٹخ رہا تھا۔

نرس نے عجلت میں ڈاکٹر کو سرنج تھماتے ہوئے، مضبوطی سے عبداللہ کے بازو کو

پکڑا۔

انجکشن لگتے ہی اس کی مزاحمت مدھم پڑتے پڑتے، ختم ہوئی تھی۔

شاہ آغا نے سراسیمہ نظروں سے بے ہوش عبداللہ کو دیکھا۔

اب کیا کہہ کے اس کی ماں کو تسلی دلائیں گے وہ۔یہ خیال انہیں پریشان کیے جا رہا

تھا۔

www.novelsclubb.com

وہ تو ماں تھیں، اُنہیں کیسے یقین دلائے کوئی۔

جب سے شاہ آغا نے اس کی سم دوسرے فون میں ڈال کے اُنہیں مطلع کیا تھا اور بات کرانے کا وعدہ کیا تھا۔تب سے اب تک ان کی بے حساب کالز آچکیں تھیں۔

اُنہیں بارہا اس کی خیریت کی یقین دہانی کرانے کے باوجود، وہ صرف ایک دفعہ عبداللہ کی آواز سننے پہ بضد تھیں۔

ماں کا وجود تو اس دن ہی وہم و وسوسوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے جب اس کی کوکھ میں پنپتی اولاد پہلی دفعہ اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔پھر دنیا کچھ بھی کہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے، پر اگر ماں کا دل مطمئن نہیں اسے چین نہیں آئے گا۔

شاہ آغا انہی کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ دوبارہ سے فون بجا اور اسکرین پہ جلی حروف میں لفظ ''امی'' جگمگانے لگا۔

آج صبح سے صغریٰ بیگم تخت پہ بیٹھیں، بیرونی دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔

بیٹے کے آنے کی خبر نے تو جیسے ان کے وجود میں خوشی کی لہر دوڑادی تھی۔ چلچلاتی دھوپ بھی اُنہیں، رحمت کی پھوار کے مصداق لگ رہی تھی۔

عبداللہ ایک ہفتے اسپتال میں رہ کے آج گھر واپس آرہا تھا۔اِس دوران، ماہااور ثنااس سے ملنے بھی گئیں تھیں، مگر وہاں رک نہیں سکتی تھیں۔

دوجوان بیٹیوں کے ساتھ اکیلے تو صغریٰ بیگم کو گھر پہ نیند نہیں آتی تھی کہاں اُنہیں اکیلا گھر پہ چھوڑ کے اسپتال جاتیں۔

"ماہا! ماہا..."

ماں کے پکارنے پہ، کچن میں کھانا بناتی ماہا نے وہیں سے صدا لگائی۔

www.novelsclubb.com

"جی امی۔"

"بریانی کو دم لگ گیا؟ بھائی آتا ہو گا۔"

ان کے سوال پہ ماہا کی مُسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

"کب کا لگا دیا تھا امی، آپ کہیں تو پلیٹ میں نکال کر دروازے پہ کھڑی ہو جائوں ؟"

بیٹی کی شرارت سمجھتے ہوئے بھی، انہوں نے معصوم بنتے جواب دیا۔

"نہیں رہنے دو۔ وہ آئے تو میں اپنے ہاتھوں سے کھلائوں گی۔"

اب کے ماہا کی کھلکھلاہٹ ان کی سماعت سے مخفی نہ رہ سکی۔

وہ مطمئن سی دوبارہ دروازے کی جانب دیکھنے لگیں کہ اچانک ہوتی دستک نے اُنہیں چونکایا۔

بے ساختہ خوشی سے نہال ہوتیں، وہ ننگے پیر بیرونی دروازے کی اور دوڑیں۔

www.novelsclubb.com

دروازے کی اوٹ سے بیٹے کا کمزور، زردی میں ڈوبا چہرہ دیکھ، ان کی آنکھیں ٹمٹمائی تھیں۔

بیٹے کو گلے سے لگاتے،اس کے پٹیوں میں جکڑے نحیف وجود کو سہارا دیتے اندر کمرے تک لے آئیں۔ان کے پیچھے ہی ٹیکسی والے کو کرایہ دیتے شاہ آغا بھی اندر آ گئے تھے۔

#عشق_لا

فریال سید✍

قسط نمبر 5۔

www.novelsclubb.com

بھائی کے آنے کی خبر سنتی ماہا، کچن سے تقریباً بھاگتے ہوئے آئی۔

کمرے میں شاہ آغا کی موجودگی نے اسے تھوڑا سا سمٹنے پہ مجبور کیا تھا۔

شاہ آغا سے تو وہ سب بخوبی واقف ہو چکے تھے، مگر پھر بھی وہ دھان پان سی دبتے قد والی لڑکی لوگوں میں گھلنے ملنے سے کتراتی تھی۔

دھیرے سے ''السلام علیکم'' کہتی ماہا نے نم آنکھوں سے بھائی کے چہرے کو دیکھا۔

بہن کی آنکھوں میں چھپے اندیشے دیکھ وہ زبردستی مُسکرایا۔

شاہ آغا نے ماہا کو دوائیں تھما کے، ڈاکٹر کی ہدایات سمجھائیں اور جانے کی اجازت مانگی

۔

''بابا! کھانا تو کھا کے جائیں، آپ کے اتنے احسانات ہیں مجھ پہ میں ایسے آپ کو جانے نہیں دوں گا۔''

www.novelsclubb.com

عبداللہ کی نحیف آواز کمرے میں گونجی تھی۔

''نہیں بیٹے آج نہیں، آج میرے نصیب کا رزق کہیں اور پکا ہے۔ مجھے اجازت دو میں جلد ہی دوبارہ آئوں گا۔''

وہ معذرت کرتے ہوئے اٹھ گئے۔ عبداللہ اُنہیں روکنا چاہتا تھا۔

مگر اسے احساس تھا کہ اتنا تو کوئی اپنا بھی نہیں کرتا جتنا پچھلے دنوں شاہ آغا نے اس کے لیے کیا تھا۔ اب اگر وہ جانا چاہتے تھے تو یقیناً ان کی کوئی مجبوری تھی۔

"آپ وعدہ کریں کہ مجھ سے ملنے جلد آئیں گے۔"

عبداللہ ناک چڑھائے کسی بچے کی طرح ان سے ضد کر رہا تھا۔

ایک شفیق مُسکراہٹ کے ساتھ وہ بولے:

"ہاں! کیوں نہیں کل ہی ملنے آئوں گا وعدہ رہا۔ بس اب تم نے پریشان نہیں ہونا اور زیادہ سوچنا نہیں۔ جلدی سے ٹھیک ہو جائو اچھا؟

www.novelsclubb.com

اثبات میں سر ہلاتے عبداللہ نے دھیرے سے کہا:

"اللہ حافظ!"

مُسکراتے شاہ آغا نے ماہا کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے باآوازِ بلند اللہ حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

امی پہلے ہی عبداللہ کے لیے کھانا لانے جا چکیں تھیں۔

اب ماہا اور عبداللہ کمرے میں اکیلے تھے۔

چھوٹی بہنوں کا بڑے بھائیوں سے انوکھا ہی رشتہ ہوتا ہے۔ بچپن میں بھائیوں کی ہر شرارت میں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ اکثر ان کے حصے کی ڈانٹ بھی بخوشی سن لیتی ہیں اور جب بڑی ہو جاتی ہیں، تو بھائی کے لاکھ چھپانے پر بھی ان کے سب کرتوتوں کی خبر رکھتی ہیں۔ اکثر تو بھائی خود ہی بتا دیتے ہیں، نہیں تو ان کے کمرے کی صفائی کے دوران کچھ نہ کچھ ایسا ضرور مل جاتا ہے جس سے بہنیں سب خبر لگا لیتی ہیں۔

بابا کے نکلتے ہی ماہا نے مشکوک نگاہوں سے بھائی کو تکا۔

عبداللہ نے بے ساختہ رُخ موڑا۔

"بھائی!"

ماہا چلتے ہوئے ان کے سامنے جا کے کھڑی ہو گئی۔

"میں سب جانتی ہوں۔اب سچ سچ بتائیں اس دن کیا ہوا تھا؟"

کم از کم آپ کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا تھا۔"

عبداللہ نے جھکی ہوئی لال آنکھیں اٹھا کہ چھوٹی بہن کے خفا خفا سے چہرے کو دیکھا۔

"سب ختم ہو گیا ماہا۔وہ...

وہ پہلی دفعہ مجھ سے بات کرنے آئی تھی۔اس کے بابا...

www.novelsclubb.com

پتا نہیں کہاں سے...

وہ بے گناہ تھی ماہا اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا ہو گا۔ وہ بالکل معصوم ہے۔ میں کیا کروں، کہیں سے اس کی خبر آتی ہی نہیں۔ کہاں سے اس کی خبر لائوں؟ کس سے پوچھوں؟

بتاماہا...

"کیا قصور تھا ہمارا؟"

ماہا جو نم آنکھوں سے اپنے بڑے بھائی کو بے ربط جملوں میں اپنا درد بیان کرتے سسکتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ دل ہی دل میں بھائی سے مخاطب تھی۔

"عشق!" ہے آپ دونوں کا قصور بھائی...

ہمارا معاشرہ کہاں دل دیکھتا ہے؟ کہاں پاکیزگی دیکھتا ہے؟

معاشرہ تو "عشق" کے عین کو "عصمت" نہیں "عریانی" سمجھتا ہے۔

"عشق" کے شین سے انہیں "شرافت" کی نہیں، شراب کی بو آتی ہے۔

اور ''عشق'' کا قاف انہیں کوئی ''قرینہ'' سکھانے کی بجائے قہر برسانا یاد دلاتا ہے۔

یہ ''عشق'' سے نفرت کرنے والوں کا معاشرہ ہے بھائی۔ یہاں ہر گناہ کے لیے عدالت ہے، کورٹ کچہری کے چکر ہیں جب کہ عشق کی سزا موت ہے۔ غیرت کے نام پہ قتل ہے۔

یہاں عشق کے قاتل کے لیے کوئی سزا نہیں اور وہ اپنا سینہ پھلا کے دندناتا، اسی معاشرے میں گم ہو جاتا ہے۔''

☆...☆...☆

شادی والے گھر کی رونق ہی نرالی تھی۔ میر ابراہیم سید کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔ وہ اپنے سارے ارمان پورے کرنا چاہتے تھے۔

اس پوش علاقے میں واقع ان کا شاندار بنگلہ، ننھے منے ڈھیروں برقی قمقموں سے سجا ہوا تھا۔

WWW.NOVELSCLUBB.COM

چچاافراہیم سید کے گھر بھی کم رونق نہ تھی۔دو گلیاں دور توان کا گھر تھا۔کوئٹہ شہر کے حالات ان دنوں کافی خراب تھے۔ تبھی شادی کراچی میں ہونا قرار پائی تھی۔

ہر سو رنگ و بو کا راج تھا۔سکینہ سید صاحبہ کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ ساری ذمہ داریاں ان کے کندھوں پہ آپڑی تھیں۔ان سب کا خیال تھا کہ عائلہ آئے گی تو ساری ذمہ داریاں سنبھال لے گی۔ مگر عائلہ تو جس دن سے آ کے اپنے کمرے میں بند ہوئی تھی پھر نکلی ہی نہیں۔شادی کا گھر، اتنی مصروفیت، کسی کا دھیان بھی اس کی طرف نہ گیا۔ایک ذاکرہ تھی جو اس کا ناشتا اور کھانا وقت پہ پہنچا دیا کرتی تھی۔

www.novelsclubb.com

معید سید بھی گائوں گیا ہوا تھا۔وہ ہوتا، تو بہن کو ضرور اپنی خوشیوں میں شامل کرتا۔ گائوں کا سارا انتظام اسے خود دیکھنا تھا اکلوتا جو تھا۔کوئی بھائی ہوتا تو اور بات تھی۔

ویران حویلی کو برقی قمقموں سے سجادیا گیا تھا۔اپنے مریدوں اور جدی پشتی خدمت گزاروں کے لیے اُنہیں یہیں کرنا تھا، جو بھی کرنا تھا۔ کیوں کہ ان لوگوں کا کراچی آکے شادی میں شرکت کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

ماہ پری نے ڈھولک کا اہتمام کیا۔ حویلی کے صحن میں خواتین کے لیے جب کہ باہر ڈیرے پہ مردوں کے لیے انتظام کیا گیا تھا۔

معید کو دولہا بننے سے پہلے ہی دولہا بنادیا گیا۔ مریدوں نے مہندی کی رسم کا اہتمام بھی کیا ہوا تھا۔ بہر حال یہ ان کی روایت تھی۔

مہندی کی رسم ادا کی گئی۔ بلوچی، براہوی لوک گیتوں پہ عطن نے سماہی باندھ دیا۔ پھر کھانا کھلا تو معید سید کو اندر جانے کا موقع ملا۔

www.novelsclubb.com

حویلی کا صحن خواتین سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔ معید کی جھلک دیکھتے ہی ماہ پری اور کچھ خواتین اس کی طرف لپکیں۔

براہوی لوک گانا حویلی کی خاموشی کو چیر رہا تھا۔

"پیٹی ناچادر مبارکباد مرے نے

مبارک باد مرے نے لاڈی لکھ وار مرے نے..."

معید شرماتا ہوا خواتین کے جھرمٹ میں صحن میں رکھے صوفے پہ آ کے بیٹھا۔

ماہ پری عجلت میں گئی اور "اسپندان" کی دھونی سلگا کے لے آئی۔اسپندان بلوچستان میں ہی پائی جانے والی ایک جڑی بوٹی ہے جس کی دھونی قدیم وقتوں سے نظرِ بد، جادو اور ٹونے سے نجات کے لیے مشہور ہے۔

معید کے لیے یہ سب کافی تھکا دینے والا تھا، مگر کیوں کہ یہی روایت تھی، وہ وہیں بیٹھا رہا جب تک اسے دولہا بنا دیکھنے کے ان کے سارے ارمان پورے نہ ہو گئے۔

www.novelsclubb.com

اسی ویران حویلی کے ایک تنہا کمرے میں، جائے نماز پہ بیٹھی آبگینے جو حویلی میں آنے والی خوشیوں کی سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔اس کا خیال تو معید کو بھی نہ آیا تھا۔

اسے احساس تھا کہ اس کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔وہ تو زندہ ہو کہ بھی زندوں میں نہ تھی۔

اِس کمرے میں اس کی نوجوانی نے جوانی اور پھر بڑھاپہ کے لبادے اوڑھے تھے، لیکن کبھی کسی نے یہ خیال نہ کیا تھا کے اتنے برسوں سے وہی دو تین سفید وسیاہ جوڑے پہنتے اور دھوتے ان کا کیا حشر ہو گیا ہو گا۔

اسی شاندار حویلی میں ایک ویران مکین برسوں سے کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے۔ کسی نے سوچا بھی نہ ہو گا کہ وہ مکین کروڑوں کی جائیداد کی مالک تھی جسے اس کے بھتیجے کی خوشی میں شامل تک نہ کیا گیا تھا بلکہ آج تو اسے بھوکا سونا تھا کہ ماہ پری اسے کھانا دینا بھی بھول گئی تھی اکثر اونچی شاندار عمارتوں کی بنیادیں کچی اور کمزور ہوتی

ہیں۔ باہر سے دیکھنے والے ان کی حسرت، اصلیت جانے بغیر کرتے ہیں۔ اگر حویلیوں کی مضبوط دیواروں پر، ان میں رہتے سسکتے لوگوں کے قصے لکھ دیے جائیں تو کوئی اِن کو حسرت سے نہ تکے۔

سجدے میں سر جھکائے آبگینے دیر تک سوچتی رہی۔

باہر صحن میں پنڈال سج چکا تھا۔ آتشی گلابی اور نارنجی پھولوں کی سجاوٹ نے صحن کا نقشہ ہی بدل ڈالا تھا۔ ہر سو دیے، پھول، خوشبو اور روشنیوں کا راج تھا۔ عائلہ اپنے کمرے کی ٹیرس سے صحن کا جائزہ لے رہی تھی۔ جہاں سے پیچھے والے خالی پلاٹ کی کا یا پلٹ کا بھی جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ صحن میں خواتین کا انتظام جب کہ پلاٹ میں مردوں کے لیے انتظام کیا گیا تھا۔

www.novelsclubb.com

کچھ دیر کو ہی سہی عائلہ کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بھائی کی خوشی کے خیال نے اسے اور بھی مطمئن کیا تھا۔

"میں نہ سہی لالا اور شانزے ہی سہی۔ کسی کو تو مکمل خوشیاں نصیب ہوں۔"

اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

عبداللہ اب بھی روزانہ اذانِ مغرب ادا کرتا تھا۔ شروع شروع میں یہ اذان اس کے درد میں اضافے کا باعث بنتی تھی، مگر اب تو جیسے عبداللہ کی آواز اس کے ہر درد کا درماں تھی۔

اب بھی وہ مغرب کی اذان کا خاص طور پہ انتظار کرتی تھی۔ خضوع و خشوع سے نماز ادا کرتی تھی۔ بس اب فرق صرف اتنا تھا کہ اسے سکون ملنے لگا تھا، اب درد بھی سکون دینے لگا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں گم ٹیرس میں کھڑی تھی۔ اسے پتا بھی نہ چلا کب، میر صاحب کی گاڑی گیٹ سے اندر آئی تھی۔ گاڑی سے اترتے میر صاحب کی نظر بے خیالی میں، ٹیرس میں کھڑی کھوئی کھوئی سی عائلہ پہ گئی تھی گو کہ ٹیرس کا رخ ویرانے کی

جانب تھا، مگر پھر بھی میر صاحب کو کئی واہموں نے گھیر لیا۔ تبھی وہ وہیں کھڑے رہ کے دیکھنا چاہتے تھے کہ عائلہ وہاں کیوں استادہ ہے۔

شک کا بیج ہی کچھ ایسا ہے ایک دفعہ جس رشتے کے بیچ اگ آئے، پھر چاہے ہزار بار اس کا سر کچلا جائے، کسی جنگلی جھاڑی کی طرح وہ اور تیزی سے بڑھتی ہے۔ میر صاحب کے دل میں بھی شک تھا جو اُنہیں وہیں کھڑے رہ کہ عائلہ سید کی ٹوہ لینے پہ مجبور کر رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑے رہتے کے مغرب کی اذان پہ عائلہ کی جنبش اور چہرے کے سکون نے انہیں حیران کر دیا۔

پر سکون چہرے کے ساتھ سراپا سماعت بنتی عائلہ مغرب کی اذان کو کسی جذب کی سی کیفیت میں سنے جا رہی تھی۔ جیسے ہی اذان اختتام کے قریب ہوئی، اپنا دوپٹا نماز کے انداز میں لپیٹتی وہ میر صاحب کو شرمندہ کر گئی۔

تو کیا عائلہ اذانِ مغرب سننے وہاں کھڑی تھی؟

کہیں میں اس پہ شک کر کے زیادتی تو نہیں کر رہا؟

میر ابراہیم سید کی پر سوچ نگاہیں خالی ٹیرس پہ ٹکی تھیں، جب کہ عائلہ نماز ادا کرنے کمرے میں جا چکی تھی۔

رنگ و بو، روشنیاں اور پھول، چچا ابراہیم سید کے گھر بھی کوئی کم رونق نہ تھی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی شانزے کی مہندی لے کے وہ لوگ یہاں پہنچے تھے۔

خوبصورت شوخ رنگوں کے امتزاج اور گوٹے کی نازک سی کڑھائی والے غرارے میں ملبوس، شرمائی شرمائی سی شانزے بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ یوں تو ان کے ہاں رواج تھا کہ دلہن جب سے مایوں بیٹھتی، اپنا چہرہ گھونگھٹ میں چھپائے رکھتی، مگر عائلہ نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا اور اب شرارت سے شانزے کو چھیڑ رہی تھی۔

"بالکل بھی روپ نہیں چڑھا تم پہ اور ایک لالا ہیں کے سونے کی طرح چمک رہے ہیں۔ کوئی جوڑ نہیں چڑیل، تمہارا ان سے۔"

عائلہ کی شرارت پہ شانزے کی دبی دبی سی ہنسی نے اسے بھی مُسکرانے پہ مجبور کیا تھا۔

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ جناب کا؟ شکر جو آج کم از کم سیاہ رنگ کا پیچھا چھوڑ دیا تم نے۔ کتنا جچ رہا ہے لال رنگ تم پہ۔"

شانزے نے اس کی دل سے تعریف کی تھی۔

"بس کیا کرتی مجبوری تھی لالا کو لال رنگ پسند ہے اور یہ جوڑا ان کی طرف سے تحفہ ہے، پہننا پڑا۔ لالا کو تو لال رنگ اتنا پسند ہے کہ تمہارے لیے بھی شادی کا جوڑا لال اور اپنے لیے بھی لال بنوایا ہے۔"

عائلہ کے لفظوں نے پھر سے شرارت کا لبادہ اوڑھا۔

"اپنے... لیے بھی؟"

شانزے کے حلق میں الفاظ پھنسے تھے۔

"ہاں تو اور کیا۔"

شرارت سے کہتی عائلہ اس کے پاس سے اٹھی تھی۔

مہندی کی رسم کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ تمام خواتین باری باری آتیں، شانزے کی ہتھیلی پہ دھرے پتے پہ مہندی لگاتیں، مٹھائی کھلاتیں اور دعائیں دیتیں۔

اِس کے بعد مہندی لگانے کا باقاعدہ آغاز ہوتا۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ مہندی لگانے والیوں کو مدعو کیا جاتا۔ جو پہلے دلہن کے ہاتھوں پہ مہندی لگانے کا آغاز کرتیں اور جیسے ہی دلہن کو مہندی لگنا شروع ہوتی، باقی لڑکیاں مہمان خواتین کے ہاتھوں پہ مہندی لگانے لگتیں۔

اسے یہ سب بالکل نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ خاموشی سے دور کھڑے وہ سب رسومات اشتیاق سے دیکھ رہی تھی کہ چچی ایک دفع پھر سے اس کی بلائیں لیتیں، اسے خود

سے لپٹا گئیں۔آج آج چچی نے یہ حرکت جانے کتنی دفعہ دہرائی تھی۔عائلہ کو تھوڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔چچی کا ایسے بار بار محبت جتلانا،اسے کھٹک رہا تھا۔

اسے خود سے لپٹائے ہی چچی نے علیزے کو آواز دی:

"علیزے!سب سے اچھی مہندی لگانے والی سے کہو میری گودی کے ہاتھوں پہ سب سے پیاری مہندی لگائے،اتنی پیاری جتنی یہ آج لگ رہی ہے۔"

ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس پر سے وارتی،وہ شانزے کی طرف بڑھ گئیں اور علیزے سب سے اچھی مہندی لگانے والی کو اس کے پاس لے آئیں۔

وہ کوئی ادھیڑ عمر خاتون تھیں جو اپنے فن میں یکتا تھیں۔خوبصورت مہندی کے لیے ان کا چرچہ دور دور تک تھا۔

www.novelsclubb.com

گہری نظروں سے عائلہ کا جائزہ لیتیں وہ بولیں:

"آپ کس طرح کی مہندی چاہ رہی ہیں؟"

دل تو کیا کہ کہہ دے ''کسی طرح کی نہیں۔''

پر بھائی کا کھلا کھلا سا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا جو آج سفید قمیص شلوار پہ کالی واسکٹ پہنے کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

عائلہ کچھ بھی ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جس سے اُس کے بھائی کی خوشی کسی طرح بھی متاثر ہو۔

تبھی زبردستی مُسکراتے ہوئے عائلہ نے جواب دیا:

''جس طرح کی مہندی لگانے میں آپ کو آسانی ہو۔لگادیں۔''اور اپنی دودھیا ہتھیلی اس کے سامنے پھیلادی جس کی کلائی میں لال گلابوں کا گجرا مہک رہا تھا۔

خاتون ایک ہاتھ میں مہندی سنبھالے،دوسرے ہاتھ میں اُس کی ہتھیلی تھامے کچھ دیر خالی نظروں سے اس کی ہتھیلی کو گھورتی رہیں۔پھر خاموشی سے مہندی لگانے لگیں۔

ابھی انہوں نے آدھے ہاتھ پہ ہی مہندی لگائی تھی کہ عائلہ کا دل اکتا گیا۔اس نے اکتاہٹ سے ہی بچنے کو مہندی والی خاتون سے بات چیت کا آغاز کیا۔

''آپ کو کتنے سال ہو گئے مہندی لگاتے ہوئے؟''

جواب سپاٹ لہجے میں ملا:

''25سال۔''

''پچیس سال؟''

عائلہ اپنے لہجے کی حیرت نہ چھپا سکی۔

''جی ہاں! پچیس سال۔میں بچپن میں اماں کے ساتھ گھر گھر چوڑیاں بیچنے جاتی تھی ۔اماں کو ہاتھ دیکھنے کا فن بھی آتا تھا۔مجھے چوڑیوں کے بے حساب ڈبوں سے نفرت تھی، جنہیں کندھوں پہ لادے میری ماں میلوں کولہو کے بیل کی طرح چلتی تھیں۔میں نے بچپن ہی میں طے کر لیا تھا، چوڑیاں کبھی نہیں بیچوں گی۔ تبھی

www.novelsclubb.com

مہندی لگانے کی طرف رجحان گیا۔مجھے اماں اپنا ہاتھ دیکھنے کا ہنر بھی دے گئی۔ گزر بسر اچھے سے ہو جاتا ہے۔"

مہندی ادھوری چھوڑ وہ عائلہ کو اپنی مختصر سی روداد سنانے بیٹھ گئی۔

"سچ میں آپ کو ہاتھ دیکھنا آتا ہے؟میرا ہاتھ دیکھ کے بتائیں میرے نصیب میں کیا ہے؟"

عائلہ کے لہجے میں اشتیاق بولا تھا۔

مہندی والی خاتون نے تھوڑی دیر عائلہ کے میک اپ سے عاری، حسین چہرے کو دیکھا۔پھر بولی:

"میں تمہارا ہاتھ پہلے ہی دیکھ چکی ہوں۔"عائلہ کا اشتیاق مزید بڑھا۔

"اچھا؟تو کیا ہے میرے ہاتھ میں؟"

خاتون نے مضبوط لہجے میں کہا:

"کچھ نہیں۔ تمہارے ہاتھ کی لکیریں کہتی ہیں تمہارا ہاتھ اور نصیب دونوں خالی ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اس قدر بنجر ہاتھ نہیں دیکھا۔ تمہارے نصیب میں اکیلا رہنا ہے۔ کسی کا ساتھ نہیں، کسی اپنے کی جھلک نہیں دکھتی تمہاری لکیروں میں۔ تم بدقسمتی کا پتھر ہو۔ سونے کو بھی چھوئو گی تو مٹی کر دو گی۔"

عائلہ نے پتھرائی ہوئی نظروں سے خاتون کا سپاٹ، جذبات سے عاری چہرہ دیکھا۔ اس کے سانولے چہرے کے عام سے نقوش مندمل ہوتے محسوس ہوئے۔ اُسے اس کے چہرے میں کئی چہرے گڈمڈ ہوتے نظر آئے۔

بابا کا چہرہ "تم دھوکے باز ہو کہتا دِکھا۔ "تو کبھی اماں کا کی "تم باغی ہو" کہتی نظر آئی ۔عائلہ نے اپنا ہاتھ جھٹکے سے کھینچا۔ خوف اور وحشت کی ڈھیروں دراڑیں اس کے خوب صورت نقوش بگاڑ رہی تھیں۔

پیچھے کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے،اس کی خوف زدہ نظریں اب بھی اس کے چہرے پہ تھیں۔

تیزی سے دوپٹا سر پہ اوڑھتی عائلہ کو یہ بھی دھیان نہ رہا کہ ہتھیلی پہ سجی ادھوری مہندی نے اس کا لال دوپٹا داغ دار کر دیا تھا۔

لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ڈھولک بجاتی،ذاکرہ کی نظریں اپنی گودی پر تھیں۔ اُنہیں یوں پریشان دیکھ وہ ڈھولک چھوڑ چھاڑ اُن کی طرف بھاگی۔"کیا ہوا گودی؟ سب خیر ہے؟آپ ٹھیک ہیں؟"

ذاکرہ کے تفکر سے پوچھنے پہ عائلہ بری طرح چونکی۔پھر خوف زدہ لہجے میں ذاکرہ سے مخاطب ہوئی۔

www.novelsclubb.com

"ذا...ذاکرہ! مجھے گھر لے چلو نا۔مجھ...مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

عائلہ کی کپکپاہٹ پہ ذاکرہ نے اس کی چادر اس کے گرد لپیٹی اور گل محمد سے گاڑی گیٹ پہ لانے کا کہہ کر اسے سہارا دیتے ہوئے گاڑی تک لائی۔

سکینہ صاحبہ کو خبر ہونے تک وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ ''لوگ کیا کہیں گے'' سے زیادہ اُنہیں اپنی بیٹی کی فکر ہو رہی تھی جو گھر پہنچنے تک بری طرح سے بخار میں پھنک رہی تھی۔

''ذاکرہ! گودی کیسی ہے؟ اٹھ گئی ہے؟''

عائلہ کے کمرے سے نکلتی ذاکرہ کو دیکھ سکینہ صاحبہ نے اس سے پوچھا۔

''ابھی اٹھی ہیں وہ! ساری رات بخار میں تپتی رہیں۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھی کرتی رہی مگر بے سود۔ ابھی طبیعت کچھ سنبھلی ہے ان کی تبھی یہ اُن کا ناشتا لینے جا رہی تھی۔''

ان کو تفصیلاً جواب دیتی ذاکرہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"سنو! میری چائے بھی اندر ہی لے آئو۔"

پر سوچ انداز میں اسے ہدایات دیتیں سکینہ صاحبہ عائلہ کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔

کمرے میں وسیع دریچے کی بدولت صبح کی میٹھی میٹھی دھوپ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رقصاں تھے۔ صحن میں لگے بے حساب گلابوں کی خوشبو ان کے رقص کے لیے خوبصورت سی دھن چھیڑے ہوئے تھے۔

سکینہ صاحبہ نے ایک بھرپور سانس لیتے ہوئے عائلہ کے کمرے کی تازہ سی صبح کو اپنے اندر اتارا۔ ان کی متلاشی نظروں نے ٹیرس میں کرسی پہ دونوں پیر سمیٹے بیٹھی عائلہ کو دیکھ لیا تھا۔

www.novelsclubb.com

وہ خاموشی سے اس کے پاس کرسی پہ آ کے بیٹھ گئیں۔عائلہ کی روئی روئی لال آنکھیں نیلے صاف آسمان پہ معلق تھیں۔جانے کتنی دیر یونہی خاموشی کا پہرہ رہا کہ آخر سکینہ صاحبہ نے چپ توڑی:

"کل کیا ہوا تھا عائلہ؟"

عائلہ بنا چونکے ان کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔اسے پتا تھا اس کی اماں تب ہی اسے "عائلہ" کہہ کے پکارتیں جب کچھ بہت پریشان کن ہوتا۔

"کچھ نہیں اماں بس دل گھبرا گیا تھا ادھر۔پتا تو ہے آپ کو نہیں پسند مجھے عجیب سی رسمیں۔خود کو اعلیٰ وارفع دکھانے کی کوششیں۔"

بیٹی کے تاثرات پڑھتی سکینہ صاحبہ کو عائلہ آج بھی کئی سال پہلے کی وہ ننھی سی عائلہ لگی،جو اس شام حویلی کے صحن میں چائے پیتی سکینہ صاحبہ کو متفکر چھوڑ گئی تھی۔

"آپ نے ایلس ان داونڈر لینڈ دیکھی ہے اماں؟"

آپ کو پتا ہے، اماں مجھے اپنا آپ ایلس جیسا لگتا ہے، اس حویلی، اس ماحول میں یکسر اجنبی۔ کوئی کیوں نہیں سمجھتا مجھے اماں؟ آپ تو سمجھیں کم از کم، میں عام سی لڑکی ہوں۔ مجھے عام سی زندگی گزارنی ہے۔"

اپنی چھوٹی سی ناک چڑھائے وہ ناراضی سے کہہ رہی تھی۔ جب کہ اس کی سادہ سی اماں اچنبھے سے اسے دیکھتی ہوئے بولیں:

"عائلے میرا بچہ! کون ڈال رہا ہے یہ خناس تمہارے ننھے سے ذہن میں اور یہ کیا کہا کس کی طرح ہو تم؟"

ننھی سی عائلہ کے تو مزاج ہی نہیں مل رہے تھے، تنک کے بولی:

ایلس اماں! وہ میری طرح ایک عام سی لڑکی تھی، جو اس حویلی کی ہی طرح عجیب و غریب جگہ میں جا کے پھنس جاتی ہے، گم ہو جاتی ہے۔ شروع میں تو اسے بھی بہت

مزہ آتا ہے، پھر آہستہ آہستہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک قید خانہ ہی ہے اور قید جتنی حسین ہی کیوں نہ ہو ہوتی تو قید ہے۔"

اماں نے فکر مندی سے اسے دیکھتے ہوئے، سمجھانے کی کوشش کی:

"دیکھو میری گودی! یہ قید نہیں، تمہارا خوبصورت محل ہے اور تم یہاں کی گودی ہو۔ پتا نہیں کتنی لڑکیاں تمہاری زندگی کو دیکھ کے رشک کرتی ہوں گی، ایسے نا شکری نہیں کرتے بچے، اللہ پاک ناراض ہو جاتا ہے اور وہ ناراض ہوئے تو بہت برا ہوتا ہے۔ اور تم؟ تم تو ہو بھی..."

اماں کی بات ادھوری رہ گئی اور عائلہ بولنے لگی:

"تم تو ہو بھی سید زادی۔ تمہیں تو دوسروں کے لیے مثال بننا چاہیے، تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ تم عام لڑکی نہیں ہو، نا بن سکتی ہو۔ ہمارے گھروں کی لڑکیاں ایسے ہی کرتی ہیں۔"

یہی نااماں؟اس نے دانت بھینچتے ہوئے پوچھا۔

"اماں! میں کیا کروں میں عام سی ہی لڑکی ہوں۔میرا دل بھی کرتا ہے، کھیلنے کو، زور زور سے ہنسنے کو، سہیلیاں بنانے کو، جو دل کرے جیسے دل کرے کھانے کو، بابا کے ساتھ کوئٹہ گھومنے کو، کسی ٹھیلے سے گول گپہ کھانے کو، اپنی سہیلیوں کے گھر جانے کو، ان کی طرح آزاد زندگی گزارنے کو، کیا کروں میں امی؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے کہ وہ مزید بولی:

"اماں! کیا سید زادیوں کے دل نہیں ہوتے؟ اگر نہیں ہوتے تو میرا دل کیوں ہے؟"

اس کی اماں نے ننھی سی عائلہ کو دکھ سے دیکھا تھا، جو بنا کچھ سنے، اپنی بات مکمل کرتے تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

اس کی پریشان سی اماں کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ اس دن بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا اور آج بھی۔

ذاکرہ جانے کب کی گم صم بیٹھی سکینہ صاحبہ کے ہاتھ میں چائے کا کپ پکڑا کے جا چکی تھی۔

بے دلی سے ناشتا کرتی عائلہ کا پھیکا چہرہ، انہیں مزید فکر مند کر گیا۔ وہ کیسے اس سے وہ بات کہیں جو وہ کہنے آئی تھیں۔ کچھ دیر دبیز خاموشی اُنہیں گھیرے رہی کہ بالآخر وہ ہمت کر ہی بیٹھیں:

"عائلے! آج معید کی شادی ہے نا۔"

عائلہ نے نا سمجھی سے اُن کی بلاوجہ کی تمہید پر انہیں تکا۔

"وہ اور شانزے بہت خوش ہیں ماشااللہ۔ میں نہیں چاہتی کہ ان کی خوشی میں کوئی رتی برابر بھی کمی آئے یا خدانخواستہ ان کی شادی رک جائے۔"

ماں کی بے تکی بات پہ عائلہ نے دہل کے کہا:

"اللہ نہ کرے اماں کون چاہے گا ایسا، کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟

"تم ایسا نہیں چاہتی عائلہ؟"

سکینہ صاحبہ کا سنجیدہ لہجہ، عائلہ کی دھڑکن تیز کر گیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ بولی:

"ظاہر ہے اماں نہیں چاہتی۔"

اماں کی پرسوچ نظریں، اس کے حیران چہرے پہ ٹکی تھیں۔

"تو شاہ زین سے شادی کر لو۔"

www.novelsclubb.com

لفظ تھے کہ پگھلا ہوا سیسہ؟ ششدر بیٹھی عائلہ حیرانگی اور صدمے کے ملے جلے تاثرات لیے اماں کے سنجیدہ تاثرات جانچ رہی تھی۔

"بھائی کی خوشی اب تمہارے ہاتھ میں ہے بیٹا۔ تمہاری چچی نے شرط رکھی ہے کہ پہلے شاہ زین اور عائلہ کی منگنی ہو گی، پھر ہی شانزے اور معید کا نکاح ہو سکے گا ورنہ نہیں۔ تم تو جانتی ہو نا، ہمارے رسم و رواج کیسے ہیں۔ اس طرح جائیداد خاندان میں ہی رہے گی اور ہمیں بھی ڈھارس رہے گی کہ ہماری گودی اپنوں میں ہی ہے۔ آخری فیصلہ بہر حال تمہارا ہی ہے کیوں کہ تم جانتی ہو ہمارا قبیلہ سب کچھ بیٹیوں کی مرضی ہی سے کرتا ہے۔"

اماں چپ ہوئیں تو پتھر کا مجسمہ بنی بیٹھی عائلہ نے تھوڑی جنبش کی اور اپنا چہرہ جھکا دیا۔ بے شک قبیلہ اپنی بیٹیوں کی مرضی ہی سے فیصلے کرتا ہے، مگر ایسے کے ان کے لیے ہر در بند کر کے، ہر ممکنہ امید کا دیا بجھا کے، اپنی مرضی کے رستے پہ مشعل روشن کر کے، پوچھا جاتا ہے اب تمہاری مرضی کیا ہے اور سید زادیاں جنہیں ہمیشہ بغاوت کی عبرت ناک انجام ہی دکھائے جاتے ہیں، خاموشی سے قبیلے کے سجھائے رستے پر ہی چل پڑتی ہیں۔

www.novelsclubb.com

''تو ہم ''ہاں'' سمجھیں؟''

ماں کا یخ بستہ لہجہ، اسے باور کرا گیا کہ اس کا جواب کیا ہونا چاہیے۔اس کے لبوں نے خود ہی اس کے عمر قید کی سزا، اس مختصر سے ''جی'' میں سنا دی۔

کچھ ہی دیر قبل، لال جوڑے میں، شرماتی شانزے کو رخصت کرا کے لایا گیا تھا۔ گو کہ طے یہی ہوا تھا کہ پہلے عائلہ کی منگنی ہو گی پھر ہی شانزے کا نکاح، لیکن یہ بھی قبیلے کی روایت تھی کہ جس گھر میں ان کی بیٹی کی بات طے ہو جاتی ہے وہاں شادی کے بعد ہی وہ قدم رکھ سکتی ہیں۔ تبھی عائلہ بھائی کی شادی پہ بھی نہ جا سکی تھی۔

بلوچی پگڑی اور آف وائٹ بوسکی کی شلوار قمیص میں، شانزے کے قدم سے قدم ملا کے چلتا معید سید کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ برات پوری دھوم دھام سے دلہن لے کے لوٹی تھی۔

پھولوں کی بارش سے ان کا استقبال کیا گیا۔

شانزے کا پہلا قدم عرقِ گلاب سے بھرے برتن میں دھلا کے گھر کی دہلیز پہ رکھوایا گیا۔ پھر رسموں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔

دور خاموش کھڑی عائلہ، خالی خالی نظروں سے تمام رسومات دیکھ رہی تھی۔ سیاہ شیفون کے جوڑے پہ خوب صورت سا نازک چاندی کا کام بنا ہوا تھا۔ شہر کے معروف ڈیزائنر شوروم سے یہ جوڑا معید نے بے حد پیار سے اپنی شادی کے لیے عائلہ کو تحفتاً دیا تھا۔

میک اپ سے مبرا چہرہ کئی اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ گزشتہ رات کی تکلیف، اس کے چہرے پہ زردی کی صورت بکھری ہوئی تھی۔

ایک چچی تھیں جو بار بار اس کے صدقے واری جا رہی تھیں اور علیزے، جو اس کے پاس سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔

عائلہ اتنی ناسمجھ نہ تھی کہ اس منگنی کے پیچھے چھپی شاہ زین کی بھوری آنکھوں میں امڈتے ستائش کا وہ منظر بھول جائے۔اسے اندازہ تھا کہ چچی کی ضد دراصل شاہ زین کی ضد ہے۔اس کا بس چلتا تو شاہ زین کے منہ پہ جا کے انکار کرتی،پر سامنے اسٹیج پر بیٹھے معید اور شانزے کی نو بیاہتا جوڑی اور ان کی خوشیوں کا ہی خیال تھا جو عائلہ کو روکے ہوئے تھا۔

"عائلے آپی...عائلے آپی!"_____

#عشق_لا

www.novelsclubb.com

فریال سید✍

قسط 6 سیکنڈ لاسٹ

علیزے نے اس کا بازو جھنجھوڑ کے اسے خیالات کی دنیا سے باہر نکالا۔

"ہمم! کیا ہوا؟" حواس بحال کرتی عائلہ نے جواب دیا۔

"وہ آپ کو منگنی کی رسم کے لیے بلا رہے ہیں سب۔"

علیزے نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

عائلہ پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے اور اس کے پیچھے کھڑی لڑکیوں کو تک رہی تھی۔

"گودی!"

www.novelsclubb.com

اپنے پیچھے ذاکرہ کی آواز سنتی وہ پلٹی تھی۔

ذاکرہ اس سے نظریں ملائے بغیر، اس کا دوپٹا سر پہ اوڑھانے لگی۔ عائلہ کسی بت کے مانند کھڑی رہی۔

بلاوجہ ہنستی، کھلکھلاتی لڑکیوں نے اسے گھیرا اور اس کے ہاتھ پکڑ کے اسٹیج کی طرف لے جانے لگیں۔ عائلہ نے مڑ کے پیچھے کھڑی ذاکرہ کو دیکھا جو اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

انگوٹھی پہنانے کی رسم کا آغاز ہونا تھا۔ سادہ سیاہ دوپٹا کس کے سر پہ اوڑھے، فق چہرہ لیے سوگوار سی دلہن کو، چچی نے منگنی کی انگوٹھی پہنائی۔ بلائیں لیتی اس پر سے پیسے وارتی چچی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی اسے رخصت کرا کے اپنے ساتھ لے چلیں۔

اب کے علیزے اس کے پاس آئی تھی۔ خوبصورت لال دوپٹا جس پہ بھاری بھرکم کشیدہ کاری نہایت نفاست سے کی گئی تھی، اسے اوڑھائی تھی۔ بت بنی عائلہ کے جذبات اور احساسات بھی شاید پتھر کے ہی ہو گئے تھے۔ تبھی اسے کچھ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"مبارک ہو سلیمہ بہن، اتنی پیاری سی دلہن آج سے آپ کے شاہ زین کی ہوئی۔"

یہ کس کی آواز تھی عائلہ نہیں جانتی تھی، مگر الفاظ کتنے زہریلے تھے یہ ضرور پہچانتی تھی۔وہ ان الفاظ کا زہر یلا ڈنک اپنے دل میں پیوست ہوتا محسوس کر سکتی تھی۔

کیا لڑکیاں اتنی ارزاں ہوتی ہیں کہ کوئی بھی آ کے ایک انگوٹھی ان کی انگلی میں پہنا کے اپنا بنا لے؟ لڑکیوں سے تو اچھی قسمت ریوڑھیوں کی ہے۔ان کا مالک، گاہک کو اُن کی قیمت کم کرنے نہیں دیتا اور گاہک اُنہیں خریدنے کے بعد کسی رنگین شیشے میں ڈال کے سجا لیتا ہے۔اُنہیں پھپھوندی لگنے نہیں دیتا۔ پھپھوندی تو ان لڑکیوں کو اکثر لگ جاتی ہے جنہیں ایک انگوٹھی کے عوض کسی کا بھی بنا دیا جاتا ہے۔

پھپھوندی؟ ہاں!

www.novelsclubb.com

یہ پھپھوندی ہی تو تھی جو اس کی ادھوری مہندی لگی انگلی سے لپٹ چکی تھی یا شاید کوئی کیڑا جو اس کی انگلی سے لپٹ کر اس کا خون چوس رہا تھا۔عائلہ کی طرف کسی نے مٹھائی بڑھائی تھی۔بہت کوشش کے باوجود وہ بالکل چھوٹا سا مٹھائی کا ٹکڑا ہی

لے سکی، مگر وہ پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتی تھی کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں اِس سے زیادہ کڑوا کچھ نہیں چکھا تھا۔اسے ایسا لگا جیسا کوئی سلگتا ہوا انگارہ زبان پہ رکھ دیا ہو۔وہ اسے تھوکنا چاہتی تھی۔

وہ اپنے سر پہ سجے بھاری بھرکم بوجھ کو اتار کے دور پھینک دینا چاہتی تھی۔

رگڑ رگڑ کے اپنی انگلی دھونا چاہتی تھی جس میں کسی اور کے نام کی ہتھکڑی لگ چکی تھی۔

لیکن اِس عالمِ وحشت میں بھی کچھ تھا جو اسے روک رہا تھا یہ سب کرنے سے۔

شاید اس کے حواس تھے جو اب بھی بجا تھے اس نے بہ مشکل خود پہ قابو پایا تھا کہ اماں اس کے پاس آ کے بیٹھیں۔

www.novelsclubb.com

"سکینہ بہن اب تو آپ میرے گھر کی رونق بھی اپنے گھر لے آئیں ہیں اب تو ہم سے انتظار نہیں ہوتا۔اب آپ بھی ہماری بیٹی جلد ہی ہمیں دے دیں۔میرا شاہ

زین تو بچپن سے، جب سے اِن کی بات طے ہوئی ہے تب سے صرف عائلہ ہی کے سپنے سجائے بیٹھا ہے۔اب تو ماشااللہ عائلہ کی پڑھائی بھی ختم ہو گئی ہے۔ہم اب کوئی بہانہ نہیں سنیں گے بس۔"

تیز تیز بولتی چچی جیسے ہی خاموش ہوئی تھیں۔عائلہ کی تو جیسے دنیا ہی خاموش ہو گئی تھی۔

اتنا بڑا دھوکا؟

او میرے خدایا...

"بچپن سے بات طے تھی؟"

تو اماں نے مجھ سے جھوٹ۔

کیوں میرا کیا قصور تھا؟

کیا ہوتا اگر مجھ سے یہ بات نہ چھپائی جاتی؟

www.novelsclubb.com

کم از کم شاید آج میری آنکھوں میں عبداللہ کے سپنے اور انگلی میں شاہ زین کے نام کی انگوٹھی نہ ہوتی۔

کچی عمر کے رشتوں کے رنگ ویسے بھی بہت پکے ہوتے ہیں۔میں بھی شاہ زین کی طرح اس رشتے کے رنگ میں رنگ جاتی مگر...

مجھے دھوکے باز کہنے والے میرے بابا نے مجھے دھوکے میں رکھا اور اماں نے تو جھوٹ بول کے منگنی کرادی؟

اس کی اب تک کی ساری زندگی کسی فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی ۔آج تک بِتایا اپنا ایک ایک دن اسے جھوٹ لگا،ڈھونگ لگا۔

ایک زندگی سے اکتائے ہوئے انسان کے ساتھ جب دھوکا ہو تو سب ڈھونگ سب جھوٹ ہی لگتا ہے۔

عائلہ کی بھی حالت غیر ہونے لگی تھی۔وحشت پہ قابو پانا مشکل تھا۔بالآخر حواس نے ہار مانی اور وحشت کی جیت ہوئی۔

ایک جھٹکے سے عائلہ نے اپنے سر پہ سجا لال دوپٹا دور پھینکا۔نوچ کے انگوٹھی اتاری اور مٹھائی کا ٹکڑا تھوکتے ہوئے، ہتھیلی کی پشت سے اپنا منہ صاف کیا۔

وہ وہیں کھڑے ہو کے زور زور سے ہنسنے لگی۔لال آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ہونٹوں کو قہقہوں سے فرصت نہ تھی۔

جو جہاں تھا وہیں انگشت بدنداں رہ گیا اور قہقہے لگاتی عائلہ،اب ایک اجنبی قدرے موٹی آواز میں قہقہوں سمیت کہہ رہی تھی۔

"تماشا تمام شد، تماشا تمام شد۔"

صوفے پہ بیٹھی سکینہ صاحبہ اس کے اچانک جھٹکے سے تھوڑا سنبھلیں، تو اس کی طرف لپکیں۔ان کی دیکھا دیکھی ذاکرہ بھی آگئی۔

"عائلہ... گودی..."

ہر نام، ہر چہرہ اس وقت عائلہ کے لیے بیگانہ تھا۔ وہ کسی صورت قابو میں نہیں آرہی تھی۔

"تماشا تمام شد۔" کانعرہ بلند کیے، وحشت اس کے سر چڑھ کے ناچ رہی تھی۔ چار زانو بیٹھے "حواس۔" اپنی ہار پہ ٹسوے بہا رہے تھے کہ بے حواسی آگے بڑھی اور عائلہ کو گلے لگالیا۔

تماشا تمام ہوا کے نہیں، عائلہ کی بے ہوشی نے اس کی وحشت ضرور تمام کر دی تھی۔ اسے ذاکرہ کے سہارے کمرے کی طرف لے جاتے سکینہ صاحبہ، کی سماعت سے ارد گرد ہونے والی چہ میگوئیاں مخفی نہ رہ سکیں۔

"ائے ہئے لڑکی پہ جن عاشق ہے۔"

"ارے ہاں! یہ تو آسیب زدہ دِکھتی تھی پہلے دن سے۔"

''مہندی کی رات بھی دیکھا تھا کیسے سب چھوڑ چھاڑ کے چلی گئی تھی۔''

''نہیں! دیکھ لینا یہ ذہنی مریضہ ہے۔''

''ارے کوئی اِسے شاہ آغا کا پتا دو۔''

''کون؟ وہ ''عبداللہ شاہ غازی'' کے مزار کے متولی شاہ آغا؟ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ بڑا علم ہے ان کے پاس۔ کوئی بتائے اُنہیں۔''

وہ عائلہ کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے۔ ''شاہ آغا'' سے ملنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔

☆...☆...☆

عبداللہ ایک معمول کی طرح ہجوم کو چیرتا سیڑھیاں چڑھتا، عبداللہ شاہ غازی کے مزار تک آیا تھا۔ یہ قدیم مزار شہر کی سطح سے کافی اونچائی پہ بنا ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مزار میں کئی تبدیلیاں آئیں لیکن اس کی مشہور سو سیڑھیاں آج بھی اس کی پہچان تھے۔

دن رات جاگتے رہنے والے شہرِ کراچی کے باسیوں کا مزار پہ تقریباً چوبیس گھنٹے ہی تانتا بندھا رہتا۔ عبداللہ گزشتہ دو سال سے دوپہر کو یہاں آتا اور رات گئے گھر جاتا۔ شاہ آغا کی سنگت نے اس کی شخصیت پہ کئی مثبت اثرات مرتب کیے تھے۔

قطع دار ڈاڑھی، سادہ سی قمیص شلوار اور کندھوں پہ ڈلا عمامہ، عبداللہ کی شخصیت کو مزید نکھار بخش چکے تھے۔ اِسی مزار کے قریب واقع پوش علاقے کی مسجد میں وہ مغرب کی نماز کی امامت بھی کرانے لگا تھا۔ چہرے پہ پھیلی وحشت کی جگہ اب سکون کا ڈیرا نظر آتا تھا۔ البتہ آنکھوں میں پھیلی ویرانی اب بھی اپنی جگہ قائم تھی۔

ان دو سالوں میں شاہ آغا نے اپنے علم کے وسیع سمندر سے چند قطرے ہی سہی عبداللہ کو بھی سونپہ تھے۔ عبداللہ کو ان کے روحانی علم کا اندازہ تو تب ہی ہو گیا تھا جب وہ عبداللہ کے قلبی سکون کے لیے اسے پانی دم کر کے دیتے تھے۔ وہ پانی پیتے ہی عبداللہ کو اپنے اندر سکون کے ٹھنڈے میٹھے چشمے بہتے محسوس ہوتے۔

لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ شاہ آغا کے علم کا اتنا چرچہ ہو گا۔ وہ تو جب مزار پہ باقاعدگی سے آنے لگا تب اسے علم ہوا۔

ان دو سالوں میں اس نے شاہ آغا کو بہت سے لوگوں کے مشکلات کا حل قرآنی آیات اور سورتوں کے ذریعے نکالتے دیکھا تھا۔ شاہ آغا کوئی پیشہ ور عالم یا عامل نہ تھے۔ وہ تو اس مزار کے متوالی اور خدا کے نیک بندے تھے جو اپنے علم کے مطابق لوگوں کو قرآنی آیات بتاتے جنہیں پڑھنے سے، اللہ پاک اپنا فضل فرماتے اور ان کی مشکلات آسان ہو جاتیں۔

اِس مزار پہ اکثر آسیب زدہ لوگوں کو بھی لایا جاتا کہ شاہ آغا کو جن نکالنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ عبداللہ کو شروعات میں تو شاہ آغا اس جگہ بیٹھنے تک کی اجازت نہ دیتے تھے جہاں وہ جن نکالتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ عبداللہ کا نڈر پن اور اُس کا بڑھتا رجحان دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

اب عبداللہ نہ صرف ان کے ساتھ بیٹھنے لگا تھا بلکہ اکثر ان کی مدد بھی کر دیا کرتا۔

آج بھی اپنی ہی دھن میں گم سیڑھیاں چڑھتا عبداللہ شاہ آغا تک آیا تھا۔

لوگوں کے جھرمٹ میں گھرے شاہ آغا کی نظر عبداللہ پہ پڑی تو وہیں سے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا جواباً مُسکراتے ہوئے عبداللہ نے بھی ہاتھ اٹھا دیا۔

آج جمعرات کا دن اور عقیدت مندوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ آج بھی سیڑھیوں کے پاس نیچے کونے میں بیٹھا ملنگ ''جمعرات بھری مراد'' کی سدائیں بلند کر رہا تھا۔

مزار کے اندرونی جانب داخل ہونے کے دو دروازے تھے۔ ایک خواتین کے لیے مختص تھا جب کہ دوسرا مردوں کے لیے۔ دونوں دروازوں سے لوگ اندر جاتے، فاتحہ پڑھتے، دعا مانگتے اور نکل آتے۔

www.novelsclubb.com

وہیں کھڑے شاہ آغا، ہاتھ میں مور کے پنکھ اٹھائے اُن کے سر جھاڑتے، بالکل ایسے جیسے ان پہ لگی گناہوں کی گرد جھاڑ کے ان کا اصل مسلمان دیکھنا چاہتے ہوں۔

اکثر کسی کو زار و قطار روتے، استغفار کرتے یا دعا مانگتے دیکھ کر چپکے سے ان کے خالی ہاتھوں میں گلاب کا کوئی پھول تھما دیتے۔ اور اس بابت دریافت کرنے پہ شاہ آغا مُسکرا کے کہتے:

"یہ لوگ ان مزاروں پہ ان قبروں سے مانگنے نہیں آتے عبداللہ۔ وہ رب سوہنے سے مانگنے آتے ہیں بس ان مزاروں پہ آ کے اِس لیے مانگتے ہیں کہ انہیں یقین ہوتا ہے یہاں مان کا رب انہیں مایوس نہیں کرے گا۔ تمہیں پتا ہی بچے دعا کیا ہے؟ دعا نام ہی کامل یقین کا ہے۔ جیسے ہی اللہ کے بندے کا یقین پختہ ہوا ویسے ہی مالکِ دو جہاں نے کہہ دینا ہے "کن فیکون۔" "ہو جا" اور پھر وہ ہو کے رہتا ہے، لیکن اکثر لوگوں کی دعائیں یہاں آ کے بھی شرفِ قبولیت نہیں پاتیں، جس کی وجہ اُن کا متزلزل یقین ہوتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ایسے لوگ یہاں سے مایوسی لے کے نکلیں۔ تبھی میں اکثر ان کے ہاتھوں میں پھول رکھ دیتا ہوں۔ ایسے ایک ننھی سی امید ان کے دلوں میں جاگ جاتی ہے کہ شاید یہ ان کے رب کا اشارہ ہے کہ ان کی

www.novelsclubb.com

مراد ضرور پوری ہو گی اور وہ خالی ہاتھ نہ جائیں گے۔بچے مایوسی کفر ہے،اس نفرت بھرے زمانے میں کسی کو کفر سے بچا کے ننھی سی امید کی کونپل پکڑا دینا گناہ کہاں ہے۔بس یہ سب رب سوہنے کی مرضی ہے،دیکھ اور سر دھن۔"

عبداللہ انہی کی باتیں یاد کرتا ہوا انہیں ایک زار و قطار روتے بزرگ کے خالی ہاتھوں میں ننھا سا پھول رکھتا دیکھ رہا تھا۔کیا سچ میں سچا یقین ہی دعا کی قبولیت کا اصل راز ہے؟اگر ہاں تو آج میں کیوں نہ ہر اندیشہ ہر وسواس بھلا کے اس کی ایک جھلک مانگ کے دیکھوں؟

آنکھیں بند کیے کھڑے عبداللہ نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے بلند کیے تھے۔

اللہ تو بڑا رحیم اور کریم ہے پاک ہے،عالی شان ہے۔میں تو تیرے سامنے کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں کجا کچھ مانگوں۔پر یارب تیرے ہی نیک بندے نے مجھے امید دلائی ہے کہ یقین سے مانگوں تو تو رد نہیں کرتا۔یارب میں بہت ہی نیچ انسان ہوں، تجھ سے مایوس بھی ہو گیا تھا۔یقین سے مانگا بھی نہ تھا، مگر آج جب مانگ رہا

ہوں تو شرمندہ ہوں۔یاربِ کریم مجھے اس کی ایک جھلک دکھادے بس۔مجھے نہیں پتا کے کیسے مجھے صرف ایک بار اس کی جھلک دکھادے یااللہ۔مجھے علم ہے کہ میری دعا بھی میری طرح پنچ ہے،میں مانگ رہا ہوں تو کیا،ایک سید زادی کی جھلک ۔پر میرا یقین اٹل ہے آج میری دعا رد نہ ہو گی۔"

دعا مکمل کرتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ آنسوئوں سے تر چہرے پہ پھیرے تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں بھی گلاب کی ایک ننھی سی کلی مہک رہی تھی۔وہ مُسکرایا پہلی دفعہ اس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کو کیسا لگتا ہو گا جن کے ہاتھوں میں شاہ آغا ہمیشہ ایسی کلیاں رکھ دیتے تھے۔کلی ہاتھ میں لیے مُسکراتا ہوا وہ شاہ آغا کو متلاشی نظروں سے ڈھونڈنے لگا۔اسے تھوڑے سے فاصلے پہ شاہ با آغا کسی کے ہاتھوں میں چپکے سے پھول رکھتے نظر آئے۔وہ بھرپور مُسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف بڑھا۔

www.novelsclubb.com

بابا احتیاط سے دعا کے لیے پھیلائے، کسی خاتون کے ہاتھوں میں پھول رکھ رہے تھے۔کالی چادر میں آدھا چہرہ ڈھکے، کسی جذب کی کیفیت میں دعا مانگتی خاتون کو خبر نہ ہوئی اور شاہ آغا پھول رکھ کے عبداللہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اب بولو بچے کیسا لگتا ہے؟"

"اُف بابا کیا بتائوں کیسا لگتا ہے۔آج مجھے ایسے لگا جیسے سچ مچ میرے ہاتھ جس دعا کے لیے بلند تھے، وہ اللہ پاک نے سن لی اور میرے خالی ہاتھ بھر دیے۔"

عبداللہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے شاہ آغا کے سامنے اپنی کیفیت بیان کر رہا تھا، کہ اس کی نظر ان کے عقب میں کھڑی اسی خاتون پہ گئی۔دعا کے لیے اٹھائے ان کے ہاتھ بے دم سے گر چکے تھے۔ان میں رکھا شاہ بابا کا پھول، چادر والی لڑکی کے پیروں کے پاس پڑا تھا۔عبداللہ کی نظر بے ساختہ اس کے پیروں پہ گئی۔

وہی سنگِ مرمر سے تراشیدہ پیر جو ایک دفعہ اس کے دل کی دہلیز پہ پڑے تھے اور ایسے ثبت ہوئے تھے کہ پھر کبھی اس کے دل کی زمین پہ کسی کے قدموں کے نشان نہ پڑے۔

وہ حیران اس کے پیروں پر سے نظر اٹھاتا، اس کے چہرے کو تکنے لگا۔ کالی چادر سے آدھا چہرہ ڈھکے، حیران جھانکتی شہد رنگ آنکھیں بے شک عائلہ سید کی تھیں۔

عبداللہ کا وجود زلزلوں کے زیرِ اثر تھا۔ اس کا ذہن کسی کند ذہن بچے کی سلیٹ کی طرح خالی تھا۔

عبداللہ اور اس چادر والی لڑکی کو یوں پتھر کا مجسمہ بنے دیکھ شاہ آغا کو بات کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔

www.novelsclubb.com

عبداللہ کچھ سنبھلا اور کچھ سوچنے سمجھنے کی کیفیت میں آیا، تو اپنے رب کے آگے سجدہِ شکر بجالانے کے لیے خالی جگہ ڈھونڈنے لگا۔

پتھر کا بت بنی کھڑی عائلہ بھی اب متحرک ہو گئی تھی۔ عبداللہ اِدھر اُدھر متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور عائلہ اسے۔ وہ خوف سے پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھی کہ کہیں عبداللہ پھر سے اس کی نظروں کے سامنے سے دور نہ ہو جائے۔

عبداللہ پھر سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اب کے اس کے چہرے پہ سکون کے آثار تھے۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے اس کی آنسو بہاتی شہد رنگ آنکھوں کو دیکھتا رہا، پھر دھیرے سے جھکا اور اس کے قدموں کے پاس سے وہ ننھی گلاب کی لال کلی اٹھائی اور دھیرے سے اس کی طرف بڑھا دی جسے عائلہ نے خاموشی سے تھام لیا۔

مزار کے اِس اندرونی حصے میں ہر وقت ہجوم رہنے کی وجہ سے دھکم پیل مچی رہتی تھی۔ عائلہ اور عبداللہ کو بھی کئی دھکے لگے تھے، مگر ان دونوں کے لیے تو وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ عائلہ کو پیچھے ہجوم میں پھنسی ذاکرہ اور سکینہ بیگم کا بھی خیال نہ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو سانس بھی نہ لیتی، بس صرف عبداللہ کو دیکھتی اور وقت تھما رہتا۔

اچانک عائلہ کو کسی نے پیچھے سے زور کا دھکا مارا تھا۔وہ بے ساختہ پیچھے مڑی،پر اپنے پیچھے کھڑے لوگوں کو خود سے بے نیاز پا کے واپس عبداللہ کی طرف مڑی، مگر وہاں عبداللہ نہ تھا۔وہ دیوانہ وار ارد گرد عبداللہ کی تلاش میں ہجوم کو ٹٹول رہی تھی ۔نقاب کب کا گر چکا تھا۔چادر سر سے سرک کے کندھوں پہ جھول رہی تھی۔پسینے میں شرابور عائلہ سید کے چہرے پہ بھورے بالوں کی کئی لٹیں چپکی ہوئی تھیں اور وہ ہراساں سی صرف عبداللہ کو ڈھونڈ رہی تھی۔

اپنے عبداللہ کو...

عبداللہ، جس کی ایک جھلک کی بھیک اس نے آج بھی مانگی تھی۔

عبداللہ جس کی آواز آج اس نے دعا مانگتے وقت سنی اور اپنی دعا ادھوری چھوڑ اسے دیکھنے لگی۔

اس نے مزار کا سارا اندرونی حصہ چھان مارا تھا، مگر عبداللہ کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ وہ تھک ہار کے بری طرح سے ہانپ رہی تھی۔ اسے اپنی حالت کا ہوش ہی نہ رہا تھا۔ جب محبوب ہی کھو جائے تو اپنی خبر رہتی بھی کسے ہے۔

تھکاوٹ اور پیاس سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی کہ پیچھے سے اماں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

#عشق_لا

فریال سید✍

www.novelsclubb.com

آخری قسط 7

عائلے کہاں چلی گئی تھی گودی ہم کب سے تمہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ پھر تمہیں یوں پریشان، خود کو ڈھونڈتے دیکھا تو آ گئے۔ ہمیں معاف کر دو بچے ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

جواب میں عائلہ بنا کچھ کہے ان کے کندھے سے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی جسے وہ عائلہ کے گم ہونے کا خوف سمجھ کے در گزر کر گئیں۔ جب کہ عائلہ اِس لیے رو رہی تھی کہ کہیں یہ اس کی وحشت ہی تو نہیں جو عبداللہ کا بہروپ دھارے یوں اس کے سامنے آ کھڑی ہو گئی تھی۔

اماں اسے خود سے لگائے سیڑھیاں اترنے لگیں۔ ذاکرہ بھی ان کے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگی کہ اچانک عائلہ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی وہ ننھی سی کلی آگے کی۔ اگر عبداللہ اُس کا وہم تھا تو، یہ پھول کیسے ؟

یہی پھول تو اس نے عائلہ کے ہاتھوں میں تھمایا تھا۔

اگر یہ اصلی ہے تو عبداللہ بھی اصلی تھا یقینا۔وہ روتے روتے بے ساختہ مُسکرا دی۔

وہ روتے روتے ہنسنے لگی اور دھوپ میں بارش ہونے لگی۔

گھر آ کے عائلہ سیدھا اپنے کمرے میں گئی۔پلنگ کے سرہانے رکھی ''ہاشم ندیم خان کی عبداللہ ''کھولی اور جہاں نظم تہ کر کے رکھی تھی،اسی جگہ وہ ننھی سی کلی رکھ کے کتاب بند کر دی۔

وہ جب سے مزار سے واپس آئی تھی کافی تروتازہ اور ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ سب اس مثبت تبدیلی سے بے حد خوش تھے۔اماں جو شاہ بابا سے ملے بنا ہی واپس آ گئی تھیں،اب ان سے ملنا اور لازم سمجھنے لگی تھیں۔ان کا خیال تھا بنا ملے اتنا فرق آیا تھا،تو مل کے علاج کرا کے تو عائلہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

اب وہ خود ہی عائلہ کو مزار پہ لے جایا کرتیں۔عائلہ ہجوم کا بہانہ کر کے اکثر آگے یا پیچھے رہ جاتی اور اپنے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے،اترتے عبداللہ سے باتیں کر لیتی۔

جب عشق کا جادو سر چڑھ کے بولنے لگتا ہے تو رنگ تو چڑھتا ہے۔عائلہ پہ بھی آہستہ آہستہ چڑھا نارسائی کا کالا رنگ اترنے لگا اور اس کی جگہ محبت کا گلابی رنگ دمکنے لگا تھا۔ہجر جب زیست میں بدلتی ہے تو آپ ہی اعلان کرتی ہے بس یہ سننے والے کی سماعت پہ منحصر ہوتا ہے کہ وہ سنے یا نہیں۔

عائلہ سے بے پناہ محبت کرنے والی اس کی سادہ سی ماں اِس سب کو مزار کی کرامات سمجھ رہی تھیں۔لالا اور شانزے بھی اس تبدیلی سے بے حد خوش تھے۔ذاکرہ کو اِس دفعہ بھی سب خبر تھی، مگر اس مرتبہ بھی وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے،اندھی بنی ہوئی تھی۔

WWW.NOVELSCLUBB.COM

ایک میر ابراہیم سید تھے جنہیں عائلہ میں آتی اتنی بڑی تبدیلیاں، خوش کرنے کے بجائے متفکر کیے ہوئے تھیں۔ شک تھا کہ ان کا جینا محال کیے ہوئے تھا۔ وہ لاکھ کوشش کرتے، مگر ان کا دماغ نہ مانتا کہ صرف مزار پہ آنے جانے سے عائلہ اتنی جلدی زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ اب تو وہ شاہ زین کے ذکر پہ بھی برا نہ مناتی۔ منگنی کی انگوٹھی بھی خود ہی پہن لی تھی اور اب اس کے مغرب میں وہ خضوع و خشوع بھی نہ تھا۔ اکثر شانزے کے ساتھ ہنستی کھلکھلاتی نظر آتی اور یہ سب باتیں میر صاحب کو باور کرا رہی تھیں کہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔ تبھی انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب خود ہی خبر لیں گے آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ آج پھر جمعرات کا دن تھا۔ اِن لوگوں نے آج پھر مزار کا رخ کیا تھا۔

www.novelsclubb.com

سکینہ صاحبہ اور ذاکرہ کے پیچھے پیچھے چلتی عائلہ نے قدم سست کیے تھے۔ لوگ اس سے آگے بڑھتے گئے، اس کے اور سکینہ صاحبہ کے درمیان ہجوم اور فاصلہ بڑھتا

گیا۔یہ عام سی بات تھی۔انہیں لگا ہجوم کی وجہ سے ایسا ہے۔ہمیشہ کی طرح عائلہ اوپر آجائے گی۔

سست روی سے سیڑھیاں چڑھتے عبداللہ نے جب دیکھا عائلہ پیچھے رہ گئی ہے،تو تیز تیز زینے سر کرتا اُس کے پیچھے پہنچا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟"

عبداللہ کی دھیمی آواز عائلہ کے کانوں میں رس گھول گئی۔وہ مُسکرائی۔

"ٹھیک ہوں اور آپ؟"

عبداللہ بھی مُسکرایا:

www.novelsclubb.com

"بالکل ٹھیک۔"

کچھ لمحے ان کے بیچ خاموشی سے گزر گئے۔وہ عائلہ کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتا رہا کہ اس کی نظر ریلنگ پہ رکھے عائلہ کے ہاتھ پہ گئی۔جہاں اس کی منگنی کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔عبداللہ کے قدم وہیں تھم گئے۔

دو تین زینے،اکیلے ہی سر کرتی عائلہ کو اس کے قدموں کی چاپ نہ سنائی دی تو،وہ مڑی۔خود سے فاصلے پہ کھڑے عبداللہ کے فق چہرے کو دیکھ وہ اس کے قریب آئی اور حیرت سے پوچھا:

"کیا ہوا؟"

عبداللہ کی آنکھوں میں بے یقینی کی چھب صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

"کیا آپ کی منگنی ہو گئی ہے؟"

اس کے اِس طرح سے پوچھنے پہ عائلہ جس نے ہلکے گلابی رنگ کی چادر سے اپنے آدھے چہرے کو ڈھکا ہوا تھا۔چادر کا کونہ چھوڑ دیا۔اِس پورے عرصے میں آج

عبداللہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اسی اثنا میں عائلہ سید نے اپنی انگلی سے شاہ زین کے نام کی انگوٹھی، جس کے ارد گرد دو مزید انگوٹھیاں بھی تھیں، اتار لیں۔

یہ ایک اچھے خاصے بڑے اور قیمتی ہیرے سے آراستہ، نہایت ہی دلکش انگوٹھی تھی جس کے اطراف میں دو مزید پتلی پتلی، ہیروں سے آراستہ انگوٹھیاں تھیں۔ جنہیں ''گارڈرنگز'' یعنی پہرے دار انگوٹھیاں کہا جاتا تھا۔

عائلہ کی ہتھیلی پہ تینوں انگوٹھیاں اور چہرے پہ عبداللہ کی نظریں جگمگا رہی تھیں۔ آج مدت بعد عائلہ کے چہرے پہ شرارت کا رقص صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

اس نے مٹھی بند کی اور اپنی پوری طاقت سے انگوٹھیاں اونچائی سے نیچے کی طرف پھینک دی۔

عبداللہ اس اچانک حرکت کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ حیرت سے پوچھنے لگا:

"یہ کیا کیا آپ نے؟"

عائلہ شرارت سے بولی:

"کون سی منگنی؟ کون سی انگوٹھی؟ اور کیا کیا میں نے؟"

اس کی اِس معصومانہ شرارت پہ وہ بے ساختہ کھلکھلا اٹھا۔ عائلہ بھی مُسکراتے ہوئے، مبہوت سی اس کے گالوں پہ بنتے گڑھے دیکھ رہی تھی۔

یہ کتنا مکمل منظر تھا۔ کاش وقت یہیں پہ تھم جاتا اور سالوں بعد اِن کے چمکتے چہرے یونہی چمکتے رہتے، مگر وقت ہماری مرضی کے مطابق نہ رکتا ہے نہ تھمتا ہے۔ وقت تو اپنی مرضی کا مالک ہے عائلہ کو خیال آیا کہ کافی دیر ہو گئی یہاں تبھی وہ اوپر جانے کو پلٹی، پلٹنے کے دوران غیر ارادی طور پہ اس کی نظریں، پاس ہی واقعہ اترنے والی سیڑھیوں پہ گئیں۔

اس کا سارہ وجود کانپ سا گیا۔ تیزی سے اپنی چادر کا نقاب لیتے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ عبداللہ اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا، لیکن یوں بت بنی کھڑی عائلہ سے تقریباً تین دفعہ پوچھ چکا تھا۔

"کیا ہوا؟"

اب کے اس نے محسوس کیا عائلہ کا پورا وجود کپکپا رہا تھا۔ وہ حیران سا اس کی پشت کو دیکھے جا رہا تھا کہ اگلے ہی پل وہ چکرا کے بے ہوش ہو گئی۔ عبداللہ اس کے پیچھے نہ ہوتا تو اسے چوٹ بھی لگ سکتی تھی۔ عبداللہ نے اسے سنبھالتے ہوئے، خود سے لگائے اوپر کی طرف قدم بڑھانا چاہے تاکہ اس کے چہرے پہ پانی کے چھینٹے ڈال سکے کہ اسے خود پہ کسی کی نظروں کا ارتکاز محسوس ہوا۔ اس نے ارد گرد نظر دوڑائی تو اسے، میر ابراہیم سید کی دو شعلہ بار نظریں، ہجوم میں گم ہوتی نظر آئیں۔

کیا کسی غیرت مند باپ کے لیے اِس سے بڑی قیامت کوئی ہو گی کہ جس بیٹی پہ انہوں نے ایک دفعہ اعتبار کیا، دوسری دفعہ پھر اس نے دھوکا دیا۔

کیسے ایک غیر مرد کے لیے باپ بھائی کی سالوں کی کمائی عزت،ان کی بیٹیاں یوں تار تار کر دیتی ہیں۔کاش میں اولاد کی محبت میں یوں اندھا ہو کے عائلہ کو معاف نہ کرتا۔کاش جیسے میں نے آبگینے کو دوسرا موقع نہیں دیا تھا ویسے ہی اپنی بیٹی کو بھی موقع نہ دیتا۔

مزار کی پارکنگ میں کھڑی اپنی مرسیڈیز میں بیٹھے میر صاحب کا خون کھول رہا تھا۔ا ن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عائلہ اور عبداللہ کو وہیں گولی مار دیں۔

ان کی نظروں کے سامنے اب بھی تھوڑی دیر پہلے کے منظر گھوم رہے تھے۔ان کی وہ بیٹی جس کی طرف ایک دفعہ ایک گارڈ کے آنکھ اٹھا کے دیکھنے پر انہوں نے اس گارڈ کی کھال اُتروادی تھی۔وہی بیٹی آج بھرے مزار کے بیچ بے پردہ کھڑی اس غیر مرد کے ساتھ ہنس رہی تھی، مُسکرا رہی تھی۔

اُنہیں جانے کیا سوجھی۔اپنی گاڑی کا ڈیش بورڈ کھول کے اپنی پستول چیک کی۔ان کا دل، جوش مارتا خون، کنپٹیوں میں پھڑکتی رگ ابھی اور اسی وقت عائلہ ابراہیم سید کو محبت کی سزا دینے پہ مجبور کر رہے تھے۔

مگر دماغ، ان کی جدی پشتی عزت اور قبیلے کی نیک نامی کی دھائیاں دے رہا تھا۔میر صاحب کو بھی دماغ کی بات میں دم لگا۔انہوں نے ڈیش بورڈ بند کرتے ہوئے ہارن بجایا۔کئی چاک چوبند گارڈز ان کی گاڑی کے گرد کھڑے ہو گئے۔غصے میں غضب ناک ہوتے میر صاحب انہیں براہوی میں کچھ ہدایات دینے لگے۔

دھیرے دھیرے آنکھیں کھولتی عائلہ کو اپنی نسوں میں اگربتی اور گلاب کے پھولوں کی تیز خوشبو چبھتی محسوس ہوئی۔اس نے تیزی سے آنکھیں کھولیں۔اس کے گرد اماں، ذاکرہ اور شاہ آغا سب تھے، مگر نہ تھا تو وہ جسے اس کی آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔

"اماں وہ...وہ...بابا...امم مم ماں...عبداللہ کہاں؟"

ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنی اماں سے سوال کرتی، عائلہ کی وحشت زدہ نگاہیں، ارد گرد کچھ تلاش کر رہی تھیں۔اس کا پورا وجود اب بھی کپکپا رہا تھا۔پسینے میں شرابور وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی:

"عبداللہ عبداللہ! کہاں ہو؟عبداللہ...عبداللہ..."

وہ،اس وقت مزار کی اترتی ہوئی سیڑھیوں کی بائیں جانب،اونچائی پر قائم ہجرے کے اندر تھے۔دروازے سے مبرا، بڑے بڑے دریچوں والا یہ ہجرا زیادہ تر شاہ بابا کے ہی زیر استعمال تھا۔

عائلہ کے یوں چیخنے پہ سکینہ صاحبہ نے دھیمی آواز میں بابا کو اس کی اِس حالت کا بتایا

۔

www.novelsclubb.com

"اسی طرح کی حالت ہو جاتی ہے بابا اس کی۔جب بھی جن چڑھتا ہے۔جب اس کی منگنی تھی تب تو جن نے بات بھی کی تھی۔اِس کے منہ سے مردانہ آواز میں

"تماشا ختم شد" کا جملہ نکل رہا تھا اس نے انگوٹھی وغیرہ سب اتار کے پھینک دیے تھے۔اب بھی جن ہی آیا ہے شاید تبھی اِس طرح کی باتیں کر رہی ہے۔"

ان کی دھیمی آواز بہ غور سنتی عائلہ کی لال آنکھوں میں آنسو تھے۔اب کے اس نے قدرے بلند آواز میں کہا:

"میں آسیب زدہ نہیں ہوں سنا آپ نے۔اس دفعہ میں بابا کو اپنا عبداللہ چھیننے نہیں دوں گی وہ میرا ہے سمجھیں۔"

تیز تیز آواز میں بولتی عائلہ بری طرح ہانپنے لگی تھی۔ہانپتے ہانپتے وہ ہنسنے لگی۔فلک شگاف قہقہے قدرے اونچے اور بھاری آواز میں تھے۔ہنستے ہنستے وہ ایک پل کو رکی اور اپنی لال آنکھیں سکینہ صاحبہ پہ گاڑتے ہوئے، تقریباً مردانہ آواز میں بولی:

"آسیب زدہ؟ہاں ہوں میں آسیب زدہ۔وہ رہتا ہے میرے اندر ہر پل ہر لمحہ۔میں ا سی کی ہوں۔کیا کر لو گے تم سب؟بولو؟نکال سکتے ہو اسے مجھ سے؟لو نکالو...نکال کے دکھادو۔"

اپنے دونوں بازو سکینہ صاحبہ کے سامنے پھیلاتے ہوئے،عائلہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔اگلے ہی پل وہ پھر سے قہقہے لگانے لگی اور انہی قہقہوں کے بیچ،وہ بے ہوش ہو کے گر پڑی۔

دور کونے میں سہمی ہوئی ذاکرہ اس کے قریب آئی تو ہی سکینہ صاحبہ نے بھی ہمت کی۔وہ بالکل بے سدھ تھی۔اس پہ غشی کا یہ دوسرا دورہ تقریباً پانچ منٹ کے وقفے سے آیا تھا۔

www.novelsclubb.com

سکینہ صاحبہ نے خاموشی سے عائلہ کا چہرہ دیکھتے شاہ بابا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔بالکل ایسے جیسے پوچھ رہی ہوں کہ آپ نے کیا کیا۔

بابا ان کی نظروں کا عندیہ سمجھ چکے تھے اور وہ تو ساری حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ عبداللہ سچ مچ عائلہ سے ملا تھا۔اُنہیں عبداللہ نے یہ بھی بتادیا تھا کہ میر صاحب نے ان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ لیا ہے۔ناصرف یہ بلکہ وہ یہ بھی کہہ گیا تھا کہ آپ عائلہ کا خیال رکھیں اِسی اثنا میں، میں میر صاحب کو ڈھونڈ کے ان سے بات کر کے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔وہ چاہتے تو اب بھی سکینہ صاحبہ کو بتا سکتے تھے کہ آپ کی بیٹی کو آپ تک پہنچانے والا عبداللہ ہی تھا، لیکن وہ اِس وقت کسی اور جھمیلے میں پڑنے کے بجائے اس پیاری سی لڑکی کی فکر میں تھے جس پہ کوئی آسیب نہ تھا بلکہ وہ شدید ذہنی دباؤ اور ہر بات اپنے اندر دفن کرتے کرتے، ایک ذہنی بیماری کا شکار ہو گئی تھی۔

www.novelsclubb.com

بابا سکینہ صاحبہ سے عائلہ کی حالت مخفی نہیں رکھنا چاہتے تھے تبھی گویا ہوئے:

"میں سمجھتا ہوں میری بہن کہ آپ مجھ سے بہت سی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں، لیکن میں معذرت چاہتا ہوں آپ کی بیٹی پہ کوئی آسیب نہیں۔یہ ایک ذہنی

بیماری کا شکار ہیں اور اِس کی وجہ کوئی اور نہیں عشق ہے۔ عشق ہی ہے جس نے اِس معصوم لڑکی کو آپ سب کے سامنے مجرم بنا کے اکیلا کر دیا ہے۔ یہ اکیلا پن ہی ہے جس نے اِسے خود میں ہی محبوب کو بسانے پہ مجبور کر دیا۔ ان کی شخصیت بری طرح سے متاثر ہو چکی ہے۔ یہ خود میں کسی اور کا بسیرا سمجھتی ہیں۔ سائنس اِسے ''ملٹی پل پرسنالٹی ڈس آرڈر'' کا نام دیتی ہے جب کہ عرفِ عام میں اِسے ''عشقِ نامراد'' کہتے ہیں۔ یہ عشق ہی انسان کو سکھاتا ہے کہ جس سے عشق کرو اسے اپنا لو۔ اپنا آپ اس کے سانچے میں ڈھال لو۔ اتنی محبت کرو کہ تم تم نہ رہو وہ بن جائو۔''

سکینہ صاحبہ کی تحیر سے کھلی آنکھوں میں اب فکر کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔

''بابا اس کا کوئی علاج تو ہو گا؟ کوئی وظیفہ؟ کوئی دوا؟ کوئی تعویذ؟''

www.novelsclubb.com

بابا دکھ سے مُسکرائے اور جواب دیا:

''لا علاج...''

عشقِ نامراد لاعلاج ہے۔سائنس میں آپ کی بیٹی کی بیماری کے لیے دوائیں ہوں گی،دے کے دیکھ لیجیے، مگر عشق کا علاج صرف عشق ہی ہے۔بے پناہ عشق اور عشق اور عشق اور عشق۔"

سکینہ صاحبہ جیسی سادہ خاتون کی برداشت کی حد اتنی ہی تھی۔وہ جو پہلے صرف عائلہ سے ڈر رہی تھیں اب انہیں بابا سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں ذاکرہ کو چلنے کا اشارہ کرتیں، سکینہ صاحبہ نے عائلہ کو ذاکرہ کے سہارے کھڑا کیا اور ہجرے سے باہر نکل گئیں۔

عائلہ کی پشت پہ شاہ آغا کی اداس نوحہ کناں نگاہوں نے دو شعر پڑھے تھے۔

www.novelsclubb.com

وہ تو دیوانہ ہے، بستی میں رہے یا نہ رہے

یہ ضروری ہے حجابِ رخِ لیلیٰ نہ رہے

گلہِ جوڑ نہ ہو، شکوہِ بیداد نہ ہو

عشق آزاد ہے، کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

تیزی سے تسبیح کے دانے گھماتے شاہ آغا، عبداللہ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے

۔

☆...☆...☆

"امی آج ایک اور دن گزر گیا، بھائی کا کوئی پتا نہیں۔اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو باقی بچی جمع پونجی بھی ختم ہو جائے گی اور بھائی کو بھی نہ ڈھونڈ پائیں گے ۔آخر آپ مجھے نوکری کی اجازت کیوں نہیں دے دیتیں؟"

ماہا کی بات میں دم تو تھا۔اب تو صغریٰ بیگم کا انکار بھی سست پڑتا جا رہا تھا۔اِس وقت بھی بیٹی کی بات اُنہیں سوچ میں ڈال گئی۔اِس سے پہلے کے وہ ہاں یا ناں کے بارے میں سوچتیں۔دروازے پہ اچانک ہوتی دستک نے دونوں کو چونکا دیا۔ماہا تقریباً

دوڑتے ہوئے دروازے تک گئی۔دروازہ کھولا تو سامنے ثناستے ہوئے چہرے اور روئی روئی آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

"ارے کیا ہوا چھوٹی سب خیر تو ہے نا؟"

چھوٹی،ماہا کا سوال ان سنا کرتی تیزی سے تخت کی جانب بڑھ گئی۔اب کے پریشان حال ماں نے پوچھا تھا۔

"کیا ہوا چھوٹی تو بتاتی کیوں نہیں؟کیا تیرے بھائی کی گمشدگی کم تھی جواب تو بھی ماں کو رلائے گی۔"

ماں کے یوں پھوٹ پھوٹ کے رونے پہ شرمندہ ہوتی ثنانے ماں کے گرد بازو پھیلاتے اپنی مشکل بیان کی۔

www.novelsclubb.com

"میں بھی کیا کروں امی۔ میڈم روز فیس کے لیے میری بے عزتی کرتی ہیں۔ آج تو انہوں نے کہہ دیا کہ اگر اگلے ہفتے تک فیس جمع نہ کرائی تو وہ مجھے کلاس میں بیٹھنے نہیں دیں گی۔"

ثنا کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے صغریٰ بیگم کے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔ اکلوتے بیٹے کی گمشدگی نے تو صغریٰ بیگم کو جیسے دیمک کی طرح چاٹ ڈالا تھا ۔ وہ اِن کچھ ہی دنوں میں صدیوں کی بیمار لگ رہی تھیں۔

ماہا جو پہلے ہی گھر پہ ٹیوشنز پڑھانے لگ گئی تھی اب ساتھ والی ہائوسنگ سوسائٹی میں واقع بیوٹی پارلر میں ریسیپشنسٹ کی جاب کرے گی جو بات اتنے دنوں سے ماہانہ منوا سکی، وہ بات پہلی مجبوری اور ثنا کے آنسوئوں نے منوادی تھی۔

یہی تو ہے معاشرے کا المیہ، جہاں باہر کام کرنے والی عورت کو برا، شوق سے کہا جاتا ہے، لیکن اس کے گھر سے باہر قدم نکالنے کی وجہ نہ دریافت کی جاتی ہے، نہ اُس کا کوئی سدِ باب کیا جاتا ہے۔

کل جب بھائی کی لاڈلی بہن ماہا پہلی بار گھر کی دہلیز پار کرے گی، تو یہ دہلیز بین کرتے ہوئے اس کے قدم روکنے کی کوشش کرے گی، مگر جن گھروں کے واحد سائبان یوں لاپتا ہو جاتے ہیں اور وہاں افلاس کے ڈیرے پڑ جاتے ہیں، تو وہیں ہی ماہا جیسی بہنیں گھر سے باہر قدم نکالتی ہیں۔اپنے گھر کا بیٹا بننے کی کوشش کرتی ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو کہ معاشرہ سفید پوش لوگوں کی سفید چادر سے سر ڈھانپی ہوئی بہنوں، بیٹیوں کو بھی عزت کی روٹی، عزت سے کمانے کا حق دے دے اور ان کی کردار کشی کی بجائے ان کے عزت کی حفاظت کرے مگر معاشرہ عزت کی بات صرف تب کرتا ہے جب کسی کی کردار کشی کرنا ہوتی ہے۔ کبھی لاپتا نوجوانوں کے پسماندگان، ان کی بیٹیوں، ان کی بہنوں کی فکر کوئی نہیں کرتا۔ تھانوں کورٹ کچہریوں کے دھکے کھاتے، اِن کی ساری جمع پونجی ختم ہو جاتی ہے، مگر گمشدہ کی کوئی خبر نہ آنا ہوتی ہے نہ آتی ہے۔ہاں آتی ہے تو کورٹ کی نئی تاریخ آجاتی ہے۔

www.novelsclubb.com

آج بھی ملک کے سینکڑوں تھانوں میں ہزاروں کیس درج ہیں جو لاپتا افراد کی تلاش چاہتے ہیں مگر ان کے ورثا یہ نہیں جانتے کہ اکثر لاپتا وہی ہوتے ہیں جو کسی اثر ورسوخ رکھنے والی شخصیت کے زیر عتاب آتے ہیں یا جو کسی اندھی گولی کا نشانہ بنتے ہیں۔

بیگم جہاندیدہ خاتون تھیں کہیں نہ کہیں انہیں اندازہ تھا کہ عبداللہ کا واپس آنا اب کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

☆...☆...☆

پیاس کی شدت سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ہونٹوں کو بار بار تر کرتے، اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے اور آنکھوں پہ بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

یہ جانے کون سی جگہ تھی، مگر تھی یقیناً کراچی سے باہر کی کوئی جگہ کیوں کہ یہاں پہنچنے تک اِنہیں اچھا خاصا وقت لگا تھا۔رستے میں دو دفعہ تو عبداللہ کی آنکھ بھی لگی تھی۔

میر صاحب کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے، عبداللہ مزار کی پارکنگ میں آیا تھا۔اِدھر اُدھر دیکھنے پہ اُسے میر صاحب اور اُن کے پیچھے گارڈز کی فوج نظر نہ آئی، تو وہ پلٹا۔اُس کے پلٹتے ہی کسی نے اُس کی پشت میں بندوق چبھوئی۔

"خبردار اگر اپنی جگہ سے ہلے تو گولی مار دوں گا۔"

عبداللہ نے بے ساختہ اپنے دونوں ہاتھ اوپر کیے تھے۔اتنے میں ایک اور بندوق کی چبھن اسے دوسری طرف اپنی پیٹھ پہ محسوس ہوئی تھی۔ابھی وہ یہ ماجرا سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ تیسرا بندہ آیا اور اس نے عبداللہ کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے تھے۔اب وہ اس کی آنکھوں پہ پٹی باندھ رہا تھا کہ زن سے ان کے پاس آ

کے رکتی مرسڈیز میں بیٹھے میر صاحب پہ اس کی نظر پڑی تھی اور سارا ماجرہ اسے سمجھ آ گیا تھا۔

اب اسے گاڑی میں ڈال کہ یہاں لایا گیا تھا۔ یہ کوئی اندھیرا کمرا تھا جس کے دبیز غالیچے کی نرمی وہ محسوس کر سکتا تھا، مگر اسے پیاس لگی تھی بہت زیادہ پیاس۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ ان پہ زبان پھیرتا وہ ان کی سختی محسوس کر سکتا تھا۔

"کوئی ہے مجھے پیاس لگی ہے۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز اس نے سنی۔ ساتھ ہی کمرے میں روشنی ہوئی۔ آنکھوں پہ بندھی پٹی کے کناروں سے روشنی اسے دکھی تھی۔

وہ جو کوئی بھی تھا کسی کو فون ملا رہا تھا۔ پھر کسی مقامی زبان میں کچھ پوچھ کے فون بند کر دیا۔

"تمہیں پانی دینے کا حکم نہیں، شور مت مچانا ورنہ... تمہیں پتا ہے۔"

عبداللہ خاموشی سے ڈھے گیا۔اوہ خدایا یہ ہم نے کیا کر دیا۔اس نے سوچا۔پتا نہیں عائل لہ کس حال میں ہو گی،امی اور بہنیں؟

کاش میں ایک باران کے بارے میں سوچتا، مگر میں تو اندھا ہو گیا تھا۔شاہ بابا نے کتنی دفعہ منع کیا مجھے، سمجھایا، سختی سے ڈانٹا، مگر مجھے تو صرف عائلہ سے مطلب تھا ۔اب جو ہو گا اُس کا ذمہ دار میں خود ہوں۔اپنے خیالوں میں گم جانے کتنی دیر ہو چکی تھی، کہ کمرے میں جیسے بھونچال سا آگیا۔تیزی سے تالا کھولتے زور زور سے اپنی زبان بولتے،دو یا شاید اس سے بھی زیادہ لوگ تھے جو اسے لینے آئے تھے۔

پیاس اور بھوک کی شدت سے وہ کھڑا بھی نہیں ہو پارہا تھا۔اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر لے جایا گیا۔باہر لے جا کے اسے کھڑا کر دیا گیا۔

www.novelsclubb.com

دور دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔وہ کتنی دیر یونہی کھڑا رہا کہ میر صاحب کی گرج دار آواز میں کچھ کہنے پہ اس کی آنکھوں پہ بندھی پٹی اتار لی گئی۔

"لڑکے ہم نے تمہیں ایک موقع دیا، مگر تم نے اسے ضائع کر دیا۔ تمہیں تمہارا قصور پتا ہے تبھی ہم دہرانا نہیں چاہتے۔ آنکھوں پہ بندھی پٹی اِس لیے ہٹائی ہے تاکہ تم دیکھ سکو، ہمارا یہ عالی شان فارم ہائوس اور اندازہ لگا سکو کہ کیا تمہاری اوقات تھی میری بیٹی سے محبت کرنے کی؟"

عبداللہ جوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ ایک پل کو گھوما اور اپنے گرد پھیلے اس شان دار لان، سوئمنگ پول اور عمارت کو دیکھا، پھر گویا ہوا:

"بے شک میری اوقات نہ تھی، لیکن محبت تو آپ کی بیٹی نے بھی کی تھی۔ اس نے میری اوقات کیوں نہ دیکھی؟"

عبداللہ کے جواب پہ وہ مزید برہم ہوئے:

www.novelsclubb.com

"نہ کہو اسے میری بیٹی۔اسے تو میں بعد میں دیکھوں گا۔تم میں اتنی اکڑ کس بات کی ہے؟جانتے نہیں کس کے سامنے کھڑے ہو؟"میرا ابراہیم سید" کے۔میرا تو نام بھی تمہارے دو کمروں کے تعفن زدہ کوارٹر سے بڑا ہے۔"

ان کے چہرے کی طنزیہ مُسکراہٹ نے عبداللہ کے تن بدن میں آگ لگادی۔

"میرا تو ایمان یہ کہتا ہے کہ اللہ کا نام سب سے بڑا ہے اور وہ ہی ہر چیز پہ قادر ہے۔ آپ تو سید ہیں،میرا خیال تھا آپ کو مجھ سے زیادہ علم ہو گا۔"

عبداللہ کی بات پہ میر صاحب آگ بگولا ہو گئے۔

"بہت ہو گئی باتیں،چلو کلمہ پڑھو نہیں تو پیر پکڑ لو۔شاید معافی مل جائے۔"

عبداللہ نے کلمہ پڑھا۔میر صاحب کے ہاتھ میں پستول تو وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا اور ذہنی طور پہ ہر طرح کے انجام کے لیے تیار تھا۔اس کی بہادری دیکھ کے ایک ثانیے کو تو میر صاحب بھی متاثر ہو گئے۔

"بہت خوب تو تم چاہتے ہو کہ تمہارا قتل میرے ہاتھوں ہو بے شک یہ کم اعزاز کی بات نہیں۔"

اگلے ہی پل انہوں نے عبداللہ کے سر پہ لیزر سے نشانہ لیتے ہوئے پستول تانی۔

عبداللہ آنکھیں موندے زیرِلب کچھ پڑھ رہا تھا۔

میر صاحب نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا اور نشانہ اس کے سر سے ہٹا کے سینے پہ عین دل کی جگہ تانا۔

عبداللہ نے آنکھیں کھول کے لیزر اپنے سینے پہ پڑتی دیکھی۔ سوالیہ نظروں سے میر صاحب کی طرف دیکھتا، اس نے سوچا کہ شاید وہ اس کے دل کو مار کے اس کے دل سے عائلہ کی محبت ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

اس کی نظروں کا سوال سمجھتے وہ خود گویا ہوئے:

''اسی دل میں عشق کو چھپائے رکھتے ہو نا؟ آج اسی دل کو ہی ختم کر دیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟''

مگر اُنہیں کیا خبر محبت کہاں مرتی ہے۔ عبداللہ بہادروں کی طرح سینہ تانے کھڑا رہا۔

''میں آج آپ کو زبان دیتا ہوں کہ میں مر بھی جائوں میرا عشق زندہ رہے گا۔ میں عائلہ کے اندر آبسوں گا۔ اس کو اپنا بنالوں گا، اس کی ہر چاہ لا میں ڈھل جائے گی۔ وہ عشق لا کہتی، ساری زندگی میری بنی رہے گی۔ آپ جو بھی کر لیں، ہمارا عشق نہیں مرے گا۔ کبھی نہیں مرے گا۔''

گولی کی گرج نے عبداللہ کو چپ کرایا تھا۔

گولی اس کے سینے کو چیرتے ہوئے اس کے دل، اس کے قیمتی دل کے پار ہوئی تھی

۔

اس کا دل جس کی دھڑکن سننے کی خواہش اکثر عائلہ کو بے چین کیے رکھتی تھی۔

اب دھڑکنا بھول گیا تھا۔

عبداللہ کھڑے قد کے ساتھ زمین پہ آ گرا۔اس کے ہونٹوں پہ اب کلمہ حق جاری تھا۔وہ تڑپتا رہا اور کوئی تب تک اس کے قریب نہ آیا جب تک وہ بے سدھ نہ ہو گیا۔

اس شاندار لان کی گھاس،ایک ماں کے اکلوتے لختِ جگر کے خون میں نہا چکی تھی۔

یہ کراچی کے قریب واقع بلوچستان کا علاقہ ''حب'' تھا جہاں میر صاحب کا یہ فارم ہائوس بھی تھا۔حب سے کراچی کے بیچ ایک گھنٹے کا فاصلہ تھا۔میر صاحب کو ابھی واپس کراچی بھی جانا تھا۔تبھی وہ اٹھے تھے۔

''لاش کو سوئمنگ پول کے نیچے دفنا دو تاکہ کبھی نہ مل سکے۔''

پست آواز میں غرور سے کہتے میر صاحب، تیز تیز قدم اٹھاتے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

ان کی گاڑی کے ہارن پہ چوکیدار گیٹ کھولتا،اس سے پہلے ہی اجڑی بکھری عائلہ نے بھاگتے ہوئے گیٹ کھولا تھا۔ بالکل ایسے جیسے وہ گیٹ کے پاس بیٹھی ان کے آنے کا انتظار کر رہی ہو۔

میر صاحب کی گاڑی جیسے ہی اندر آئی وہ دوڑتی ہوئی ان کے پاس پہنچی۔

"بابا! بابا! عبداللہ کہاں ہے۔پلیز بولیں آپ نے اس کے ساتھ کچھ برا تو نہیں کیا۔ بابا آپ کو اللہ کا واسطہ، مجھے مار دیں اسے کچھ نہ کہیں۔ بابا آپ کچھ بولتے کیوں نہیں۔"

www.novelsclubb.com

میر صاحب اس کی باتیں ان سنی کرتے اندر جانا چاہتے تھے۔وہ ان کے پیروں سے لپٹ گئی۔

"بتائیں بابا جواب دیں۔ کہاں ہے میر اعبداللہ؟ کیا کیا آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ آپ کو قرآن کا واسطہ، پلیز اس دفعہ ہمیں معاف کر دیں۔ آج کے بعد میں مر جائوں گی، مگر اپنے کمرے تک سے باہر نہ نکلوں گی، بس آج اسے چھوڑ دیں۔ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، مگر اسے جانے دیں۔ آپ کو میری چادر کا واسطہ، بابا پلیز۔"

میر صاحب نے جھٹک کے اسے اپنے پیروں سے پرے کیا۔

"مار ڈالا میں نے اسے۔ اس کے دل کو۔ اس کے عشق کو اس کے غرور کو۔ عبرت بنا ڈالا میں نے اسے تاکہ پھر کبھی کوئی کسی سید زادی سے عشق کرنے کا سوچے بھی نہ۔ پھر کوئی عشق نہ کرے، عشق کا نام بھی نہ لے۔ سمجھی تم۔"

www.novelsclubb.com

عائلہ سکتے کی کیفیت میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔

اس کی سفید چادر پہ پیر رکھتے، میر صاحب کے قدموں کی دھمک دور ہوتی چلی گئی۔

ستون کے عقب میں چھپی ذاکرہ تیزی سے عائلہ کے قریب آئی اسے گلے لگا کہ ر لانا چاہا۔

"ذاکرہ سنا تم نے۔ عبداللہ مر گیا۔ اس کا عشق مر گیا۔ ذاکرہ میرا... عبداللہ مار دیا۔ میں کیا کروں بولو۔ اب میں کیا کروں بتائو۔"

عائلہ سنگِ مرمر کی روش پہ بیٹھی روتی رہی۔ ساتھ میں اسے خود سے لگائے بیٹھی ذاکرہ بھی۔ اچانک عائلہ روتے روتے ہنسنے لگی۔

ذاکرہ اس سے دو قدم پیچھے ہٹی۔

میرا عشق نہیں مر سکتا۔ میرا عشق تو ابھی زندہ ہوا ہے عبداللہ میرے اندر رہے۔ بول رہا ہے۔ باتیں کر رہا ہے۔ اسے بھی مجھ میں رہنا اچھا لگ رہا ہے۔ سنو ذاکرہ اس کی آواز سنو۔"

www.novelsclubb.com

عائلہ اپنے ہوش کھو بیٹھی تھی۔ذاکرہ کی آنکھوں میں خوف تھا۔عائلہ اُٹھی اور روش کے بیچ کھڑے ہو کے ایک ہاتھ اوپر کی طرف ایسے اُٹھایا جیسے کوئی ان دیکھی رسی تھام رکھی ہو اور دوسرا ہاتھ ہوا میں پھیلائے۔وہ گول دائروں میں گھومنے لگی۔اس کا سفید لباس، پورے چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔گول گول گھومتی وہ گنگنا رہی تھی۔

"عشقِ من نہ مرد و زندہ شد، بگو عشق لا

یارِ من مرد،

مرد واز من شد، بگو عشق لا

صحرائے دل ام سیراب شد، آتشِ چشم ام یخ شد

ایتر کہ "چاہ" "من" "لا" شد، زندگی من تمام شد

بخدا تمام شد

عشق لا شد

عشق لا شد

اس کی آواز کا سوز اور دیوانہ پن ذاکرہ کو حیران کیے جا رہا تھا کہ اسے گول گول گھومتی عائلہ میں عبداللہ کی جھلک دکھی۔اسے ایسا لگا کہ عائلہ کے ساتھ ساتھ عبداللہ بھی گول دائروں میں گھوم رہا تھا۔اس کے ہاتھوں میں عبداللہ کے ہاتھ تھے، پیروں کے ساتھ ساتھ عبداللہ کے پیر اور چہرے میں عبداللہ کا چہرہ۔

آج اسے عائلہ میں آبگینے بھی دِکھی تھی اور عائلہ، آبگینے بے شک جتنے نام بدل لو، کردار تو ایک ہی ہے۔ عشق کو لا بنانے والوں کا انجام ایک ہی ہے۔

عشق جب تک ہے، عشق کرنے والے کے لیے درد ہے، مگر جیسے ہی عشق کی چاہ ختم ہو جاتی ہے، زندگی سے جڑی ہر خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ایک بے حسی سی ہر سو چھا جاتی ہے، پھر کسی چیز سے فرق ہی نہیں پڑتا۔ایسے لوگ رہیں نہ رہیں بات ایک

ہی ہے۔خواہ عائلہ ہو یا آبگینے آج یا کل ہر کوئی اُنہیں بھلا دے گا،نہ بھلا پائے گا،تو ا ن کے عشق کو۔"عشق لا"کو...

"بہت مبارک ہو آپ کو سکینہ بہن۔اللہ پاک مبارک کرے۔"اپنی ہی سوچوں میں گم سکینہ صاحبہ جبراً مُسکراتے ہوئے مقابل کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

کھوئی کھوئی سی سکینہ سید جانے کب سے اِس الگ تھلگ سے صوفے پہ بیٹھی تھیں ۔انہیں ارد گرد کی خبر ہی کہاں تھی۔وہ تو اپنی ہی فکروں میں گم تھیں۔

آج اس ہولناک واقعے کو کافی دن گزر گئے تھے،مگر عائلہ کی طبیعت تھی کہ سنبھل ہی نہیں پا رہی تھی۔اسے جیسے ہی ہوش آتا،وہ چیخنے چلانے لگتی۔بخار تھا کہ کم ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔

www.novelsclubb.com

ڈاکٹر آتے نیند کے انجکشن لگا کہ چلے جاتے۔

میر صاحب کئی دن متذبذب سے سوچوں میں گم رہے۔ بالآخر اُن کا فیصلہ آگیا۔ وہ چاہتے تھے عائلہ بھی ""ستی"" بن کے اپنے کمرے میں مرتے دم تک قید ہو جائے۔

معید جس نے کبھی بابا کی کسی بات، کسی فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ آج پہلی دفعہ ان کے فیصلے کے خلاف بولا تھا اور بدلے میں عاق کیے جانے کی دھمکی نے اسے چپ کرا دیا تھا۔

ظہر کے بعد، پر تکلف کھانے پر مدعو، مہمانوں کے بیچ اعلان کیا گیا کہ عائلہ سید نے اپنی مرضی سے اللہ کی محبت کو دنیا پر ترجیح دیتے ہوئے، ستی بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ سب خواتین باری باری سکینہ صاحبہ کو مبارکباد دے رہی تھیں اور گم صم سکینہ صاحبہ کی نظروں کے سامنے آبگینے سید کا گلابی، معصوم چہرہ گھوم گیا۔ جس کو ستی بنانے میں سکینہ صاحبہ کا بھی اچھا خاصا ہاتھ تھا۔

آج جب یہی وقت اپنی بیٹی پہ آیا، تو ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

سلیمہ صاحبہ اور علیزے نے تو رو رو کے برا حال کر لیا تھا۔ان کے نظروں کے سامنے شاہ زین کا اُداس شکست خوردہ چہرہ جو گھوم رہا تھا۔

شانزے اور ذاکرہ، عائلہ کے پاس ہی کمرے میں موجود تھیں۔دوائوں کے زیرِاثر وہ بے ہوش پڑی تھی۔شانزے کی آنکھیں روتے رہنے کی وجہ سے سوج چکی تھیں ۔

مہمانوں کو بتایا گیا تھا کہ عائلہ کی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے باقاعدہ رسم نہیں کی گئی۔

مہمان رخصت ہونے لگے تو سکینہ صاحبہ کو اپنا دم مزید گھٹتا محسوس ہوا۔انہیں ایسا لگنے لگا کہ سالوں پہلے جو مشورہ انہوں نے میر صاحب کو آبگینے کے حوالے سے دیا تھا۔اسی کی سزا آج ان کی پھولوں جیسی بیٹی کو مل رہی تھی۔وہ ایک کوشش کر کے یہ سب روکنا چاہتی تھیں۔

تبھی وہ تیزی سے میر صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔میر صاحب اپنے کمرے میں آرام سے، کوئی کتاب کھولے بیٹھے تھے۔آج کتنے عرصیبعدان کے چہرے پہ یہ سکون چمک رہا تھا۔

"میر! میں نے کبھی آپ سے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں مانگا۔آج پہلی دفعہ میں آپ سے کچھ مانگ رہی ہوں۔مجھے انکار نہ کیجیے گا خدارا۔مجھے میری عائلہ واپس کر دیں۔"

آنسوئوں کے بیچ بہ مشکل اپنی بات مکمل کرتی سکینہ سید، کی طرف دیکھتے میر صاحب کے سکون میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔وہ بدستور سکون سے اُنہیں دیکھتے ہوئے بولے:

www.novelsclubb.com

"آپ یہ کیوں نہیں سمجھ لیتیں کہ ہماری عائلہ مر گئی؟میرے لیے تو عائلہ اس دن ہی مر گئی تھی جس دن اس نے اس نامحرم کو خود کو چھونے دیا تھا۔یہ عائلہ کی کوئی پرچھائی ہے جو اِس وقت اپنے کمرے میں قید ہونے جا رہی ہے۔آپ کی بیٹی تو اس

دن ہی چلی گئی تھی جس دن اس نے سچا عشق کیا تھا۔میں بھلا کیسے آپ کو آپ کی بیٹی لوٹا سکتا ہوں؟جب کہ اب تو وہ خود ہی،خود میں باقی نہیں رہی۔"

اطمینان سے اپنی بات مکمل کر کے وہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے۔

روتی سکینہ صاحبہ کے پاس اب وہاں رکنے کا کوئی جواز نہ تھا۔وہ واپس صحن میں آ چکی تھیں جہاں مہمانوں کے جانے کے بعد نوکر صفائی کر رہے تھے۔آدھا چاند آسمان پہ چمک رہا تھا۔عائلہ کے چیخنے کی آوازان کی سماعت سے ٹکرائی۔وہ بھاری اجنبی آواز میں چیخ رہی تھی۔

"وہ عشق نہیں مر سکتا جو "لا" بن جائے۔میرا عشق زندہ ہے زندہ رہے گا۔"

اس کی ہذیانی چیخیں،چیخ چیخ کے بول رہی تھیں کہ اب عائلہ میں عائلہ کہیں نہیں۔

سکینہ صاحبہ نے آنسوئوں کی دھند کے پار ادھورے چاند کو دیکھا۔چاند نے انہیں دلاسا دیتے سرگوشی کی:

"نصیب کا لکھا نہیں مٹتا اور اس کے نصیب میں عشق تھا بس! عشق صرف عشق، بے تحاشا عشق، چاہ کی عشق، لا کی عشق، عشق ہی عشق... بس عشق ہی عشق۔"

ان کے لبوں نے دھیرے سے سرگوشی کی تھی "الوداع عائلے الوداع" اور ممتا نے ہار کے اپنی بیٹی "عشق لا" کو سونپ دی

ختم شد

www.novelsclubb.com